سلسلہ ارتھوڈوکس

(فراموش شدہ اڈیشن)

ترتیب

شائستہ خان

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

اسرارِ خودی

(فراموش شدہ اڈیشن)

ترتیب

شائستہ خان

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

پہلی بار فروری ۱۹۹۲ء

تعداد: 500

قیمت 75/-

لیزر ٹائپ سیٹنگ: آرٹ پریس (پرنٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

اے امام اے سیّدِ والانسب
دودمانت فخرِ اشرافِ عرب

سلطنت را دیدہ افروز آمدی
عقلِ کُل را حکمت آموز آمدی

آشنائے معنیِ بیگانہ
جلوۂ شمعِ مرا پروانہ!

مرغِ فکرم گلستاں ہا دیدہ است
از ریاضِ زندگی گل چیدہ است

ایں گل از تارِ رگِ جاں بستہ ام
تازہ تر در دستِ تو گل دستہ ام

بود نقشِ ہستیم انگارۂ
ناقبولے، ناکسے، ناکارۂ!

عشق سوہاں زد مرا آدم شدم
عالمِ کیف و کم عالم شدم

حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام
در رگِ مہ دورۂ خوں دیدہ ام

بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست
تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست

از درونِ کارگاہِ ممکنات
برکشیدم سترِ تقویمِ حیات

من کہ ایں شب را چو مہ آراستم
گردِ پائے ملّتِ بیضا شستم

ملّتے در باغ و راغ آوازہ اش
آتشِ دلہا سرود تازہ اش

ذرّہ کشت و آفتاب انبار کرد
خرمن از صد رومی و عطّار کرد

آہ گرمم، رخت بر گردوں کشم
گرچہ دودم از تبارِ آتشم

خامہ ام از ہمّتِ فکرِ بلند
رازہائے ناپردہ در صحرا فگند

قطرہ تا ہم پایۂ دریا شود
ذرّہ از بالیدگی صحرا شود

ملّت ار جسم است شاعر چشمِ اوست
جسم را از چشم بیتا آبروست

چشم از نورِ محبّت روشنم
اشک بار از دردِ اعضائے تنم

نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

(اسرارِ خودی: پہلا اڈیشن: ۱۹۱۵)

یہ اقبال کی دو قسطوں میں خارج شدہ، ایک منظوم پیش کش کا مکمّل متن ہے جس کا عنوان ہے 'پیش کش بحضور سر سیّد علی امام'!

اسرارِ خودی کے پہلے اڈیشن (۱۹۱۵ء) میں موجود ۱۹ اشعار پر مشتمل اس پیش کش کو جب دوسرے اڈیشن میں شامل کیا جانے لگا تو گیارہ شعر (نمبر چھے تا سولہ) خارج کر دیے گئے[۳] اور اب یہ پیش کش آٹھ اشعار پر مشتمل باقی رہ گئی۔ چونکہ اسرار خودی کے اس دوسرے اڈیشن میں اس انتساب کے شامل رہنے کی بات عبدالمجید سالک سے لے کر جاوید اقبال تک اقبال شناسوں پر عام طور سے بہت واضح نہیں ہے، اس لیے یہاں دوسرے اڈیشن میں شامل پیش کش کے اشعار کا عکس دیا جا رہا ہے۔ عکس اس لیے کہ اس پوری بحث میں حیرت ناک طور سے سر علی امام کے نام انتساب کی ترمیم شدہ شکل کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اسرار خودی کے اس اڈیشن کو اقبالیات کی تاریخ سے اس طرح کھرچ دیا گیا ہے کہ اس کے عدم اور وجود دونوں برابر ہو گئے ہیں اور اب سب نے متفقہ طور پر تیسرے اڈیشن کو دوسرا اڈیشن قرار دے لیا ہے۔ اب یہ بات کسی کو یاد نہیں رہی ہے کہ اقبال نے اسرار خودی کے دوسرے اڈیشن میں صرف ان اشعار کو خارج کیا تھا جو حافظ کے متعلق تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پہلے اڈیشن کا طویل دیباچہ بھی ختم کر دیا تھا اور اس کی جگہ ایک صفحے کا مختصر دیباچہ اس دوسرے اڈیشن کے لیے لکھا تھا جس کا عکس ہم پیش کر رہے ہیں۔ اس دوسرے اڈیشن کے دیباچے کے عکس میں آپ خود اقبال کی اپنی یہ عبارت بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں جس میں انھوں نے یہی دونوں باتیں (حافظ اور دیباچۂ اوّل کے متعلق) بڑی وضاحت سے کہہ دی ہیں یعنی حافظ کا ذکر تو ہے، مگر علی امام کے تعلق سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ جہاں

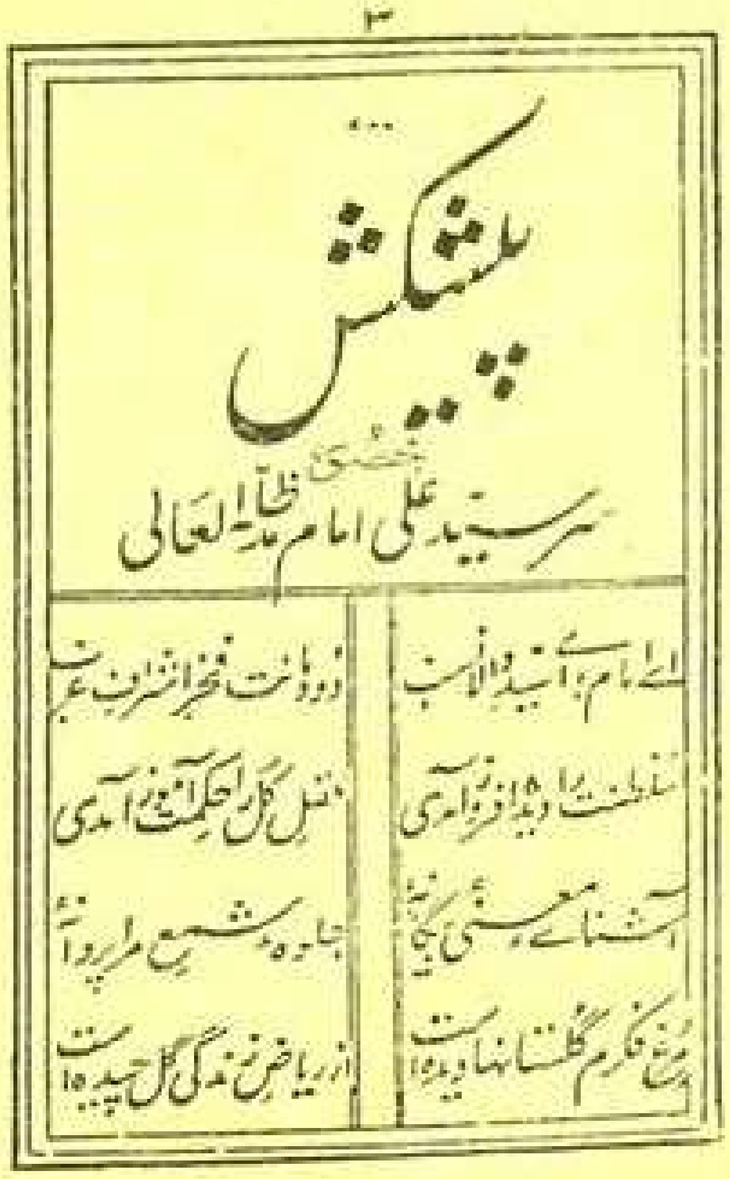

۳

...

پیشکش

بخدمت
سر سید علی امام مدظلہ العالی

اے امام! اے سید والا نسب
ذرۂ دانت فخر اشراف عرب

سلطنت را دیدۂ افزودۂ آمدی
مثل گل از خلوت جمعیت آمدی

آشنائے معنیٔ بیگانہ باش
جادہ پیمائے شریعت مردوار

منتِ فکرم گلستانہا دیدہ است
از ریاضِ زندگی گل چیدہ است

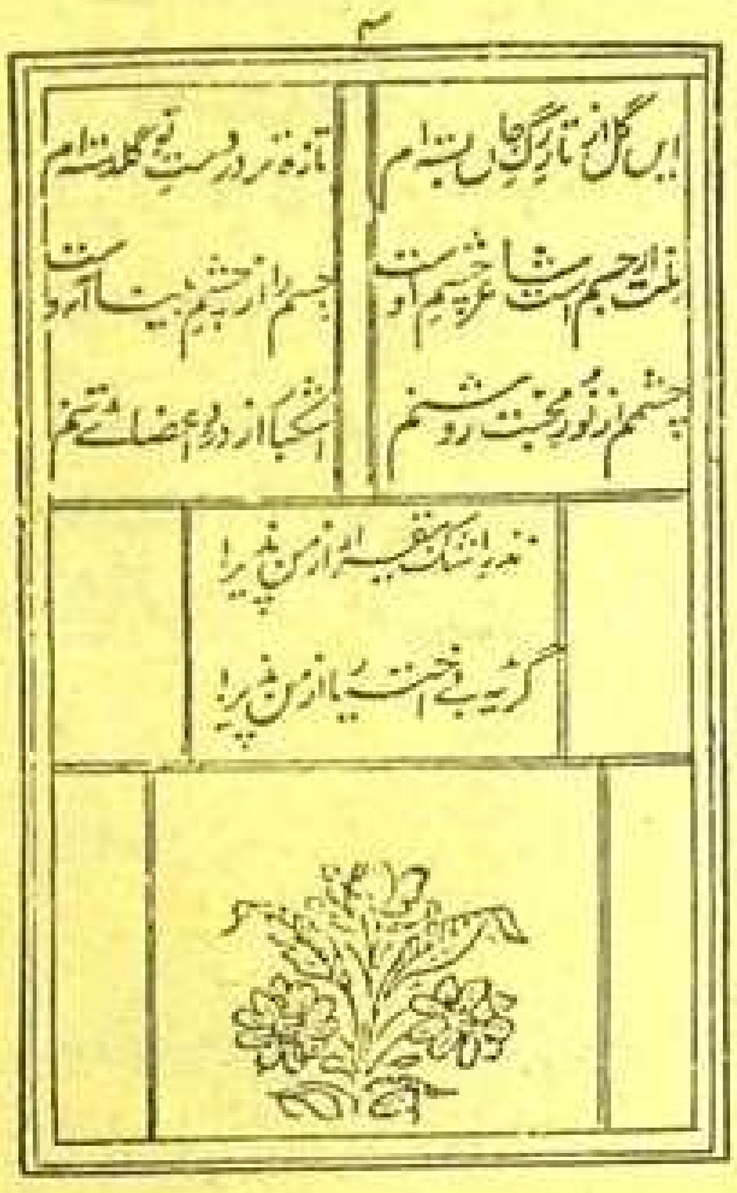

۴

ایں گل از تارِ گریباں بستہ ام
تازہ تر در دستِ تو گلدستہ ام

ملتے را جسم است شاعر چشم او است
جسم را از چشم بینا آبرو است

چشمم از نورِ محبت روشنم
اشکبار از درد اعضائے تنم

مدعا اشک بقیہ دامنم پذیرا
گریۂ بے تابِ من پذیرا

تک علی امام کا تعلق ہے' اس دوسرے اڈیشن میں انتساب اپنی جگہ موجود ہے جسے آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ بس کچھ اشعار کم کر دیے ہیں' جو خود شاعر کی اپنی مدح میں تھے۔ تاہم شاعر کی اپنی مدح میں سارے اشعار اب بھی خارج نہیں کیے گئے۔ لیکن تعداد کم کر دینے سے ایک توازن ضرور آ گیا' جس سے نظم کا ڈھیلا ڈھالا پن ختم ہو گیا اور متناسب کیفیت پیدا ہو گئی۔

تو اب نظم کا عکس ملاحظہ ہو جو اسرار خودی کے دوسرے اڈیشن کے دو صفحوں' صفحہ ۳-۴ پر شائع ہوئی ہے۔ ترمیم شدہ ضرور ہے لیکن اپنی پوری ہستی اور اپنے پورے وجود کے ساتھ ہمارے سامنے ہے اور بار بار دہرائے جانے والے ان مفروضات کی مجسم تردید بن جاتی ہے کہ اقبال نے اس دوسرے اڈیشن سے تمام و کمال خارج کر دیا تھا!۔

○

آیئے' اتنی بات پھر دہرا لیں' کہ اسرار خودی کے پہلے اڈیشن کو اقبال نے سر علی کے نام معنون کیا' یہ انتساب ۱۹ اشعار پر مشتمل تھا' دوسرے اڈیشن میں انھوں نے اس انتساب میں تناسب لانے کے لیے اس میں سے وہ سارے (گیارہ) اشعار الگ کر دیے جو خود اقبال کی اپنی مدح میں تھے۔ (جسے اردو تنقید کی اصطلاح میں شاعرانہ تعلّی کہہ لیجیے)

مگر پھر ہوا یہ کہ ان اشعار کو اقبال نے اس جگہ سے تو ضرور ہٹایا' لیکن بالکل عاق نہیں کر دیا' بلکہ آگے جا کے اسرار خودی کے اس باب میں جگہ دے دی جسے انھوں نے تمہید کا عنوان دیا ہے' جہاں اس قسم کے اور بھی دوسرے اشعار پہلے سے موجود تھے اس لحاظ سے یہ انتساب سے الگ کیے گئے اشعار تمہید میں اپنی جگہ پا کر نہایت خوبی سے کھپ گئے جیسے ان کی اصلی جگہ یہی تھی اور انتساب جو اب صرف آٹھ اشعار پر مشتمل رہ گیا' اپنی جگہ نہایت موزوں' چست اور نک سک سے درست ہو گیا۔

○

ان اشعار کے بارے میں سرودِ رفتہ کے مرتّبین غلام رسول مہر اور صادق علی دلاوری صفحہ ۶۸ پر لکھتے ہیں "اشعار ذیل اسرارِ خودی کے پہلے اڈیشن میں بطریق انتساب درج تھے' دوسرے اڈیشن میں یہ حذف کر دیے گئے۔ مگر بعض اشعار کو تمہید میں جگہ دے دی!"

اقبال شناسی میں ان کا بڑا درجہ ہے' مبادا یہ ہو کہ ان کی اپنی لاعلمی یا غلط فہمی

کے نتیجے میں بعد کے لوگ گمراہ ہوتے رہیں، اس لیے ضروری ہے کہ اس مختصر نوٹ کی ہر شق کے بارے میں عرض کر دیا جائے۔ ان کا بیان اوپر نقل ہو چکا ہے جو اس جملے سے شروع ہوتا ہے جسے ہم تجزیاتی طور سے پھر دہراتے ہیں!

(۱) اشعار ذیل اسرارِ خودی کے پہلے اڈیشن میں بطریقِ انتساب درج تھے۔

(۲) دوسرے اڈیشن میں یہ حذف کر دیے گئے۔

(۳) مگر بعض اشعار کو تمہید میں جگہ دے دی۔

واقعہ یہ ہے کہ دوسرے اڈیشن میں گیارہ اشعار پیش کش سے نکال کر تمہید میں منتقل کر دیے گئے۔ باقی نہ پیش کش حذف ہوئی نہ بقیہ اشعار، بات صرف اتنی ہے کہ دوسرے اڈیشن کو دیکھے بغیر یہ بیان سنی سنائی پر جاری کر دیا گیا ہے۔ اس بیان کے الفاظ "بعض اشعار" کے ابہامی انداز سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے یہ بات مطلق نہیں آئی کہ وہ بعض اشعار کون سے تھے جن کو تمہید میں جگہ دی اور وہ بعض اشعار کون سے تھے جن کو تمہید میں جگہ نہیں ملی اور پھر اگر تمہید میں جگہ نہیں ملی تو وہ گئے کہاں!۔

دراصل یہ بیان پرابے ہاتھ سر بھروسا کر کے (بلا حوالہ) نقل کر دیا گیا ہے اور اس طرح کی نقل در نقل میں جہاں بغیر ذاتی محنت کے کریڈٹ لینے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ ہوتا ہے کہ دس میں نو بار تو یہ معاملہ لوگوں پر نہیں کھلتا، لیکن ایک بار سامنے آجاتا ہے تو CREDIBILITY مجروح ہو جاتی ہے۔ یہی اس بیان کے ساتھ ہوا کہ انھوں نے اپنے پیش رو عبدالواحد معینی مرتّب باقیاتِ اقبال کے بیان پر آنکھ بند کر کے یقین کرتے ہوئے اسے من وعن نقل کر دیا تھا، حالاں کہ منقول عنہ خود ہی ایک بے بنیاد بیان دے رہے تھے[1]

ع آنکس کہ خود گم است کرا رہبری کند

---

[1] عبدالواحد معینی نے یہ بیان کہیں سے لیا ہے یا خود تحقیق کیا یہ کہنا مشکل ہے۔ اگر کہیں سے لیا تھا تو ان کا مأخذ کیا تھا، ایک غلط بات کے لیے ہمارا یہ بتانا بھی آسان نہیں۔ اس بحث میں ہم یہ بھول جائیں گے کہ بالکل واضح طور سے آپ پر ثابت کر دیں کہ سرود رفتہ کا بیان باقیات سے ماخوذ ہے۔ یہ بات یہاں کہنا اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے محققین اپنے پیش روؤں سے بلا حوالہ نقل کر لیتے ہیں اور کریڈٹ خود لے لیتے ہیں، مگر کبھی کبھی یہ بات گرفت میں آجاتی ہے۔ پھر جب خود حوالۂ اوّل غلط ثابت ہو جاتا ہے تو حوالۂ ثانی بچارا کہاں ٹھہرے گا، جیسا کہ اس معاملے میں ہوا اس لیے ہم دونوں کو آمنے سامنے رکھ دیں۔

باقیات (صفحہ ۱۲۳)

"مرقومہ ذیل اشعار" اسرارِ خودی کے پہلے اڈیشن میں بطریقِ انتساب درج تھے۔ دوسرے اڈیشن میں انتساب حذف کر دیا گیا مگر بعض اشعار کو تمہید میں جگہ دی۔ یہاں کل اشعار یکجا پیش کیے جاتے ہیں۔"

سرود رفتہ (صفحہ ۶۸)

اشعار ذیل اسرارِ خودی کے پہلے اڈیشن میں بطریقِ انتساب درج تھے۔ دوسرے اڈیشن میں یہ حذف کر دیے گئے۔ مگر بعض اشعار کو تمہید میں جگہ دے دی۔ یہاں کل اشعار یک جا پیش کیے جاتے ہیں۔

اسرارِ خودی کے دوسرے اڈیشن میں یہ تمہید صفحہ ۵ سے صفحہ ۱۷ تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ تمہید نظیری کی غزل کے ایک شعر سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں کل ۴۹ اشعار ہیں۔ زیر بحث اشعار شعر نمبر ۵ کے بعد مسلسل چلتے ہیں اور صفحہ ۱۵ سے گزر کر صفحہ ۱۶ تک چلتے چلے گئے ہیں۔

صفحہ ۱۵، ۱۶ کا عکس بھی اس لیے دیا جاتا ہے کہ وہ اشعار اپنی جگہ پر پہچان لیے جائیں ان اشعار کو نشان زد ※ کر دیا گیا ہے۔

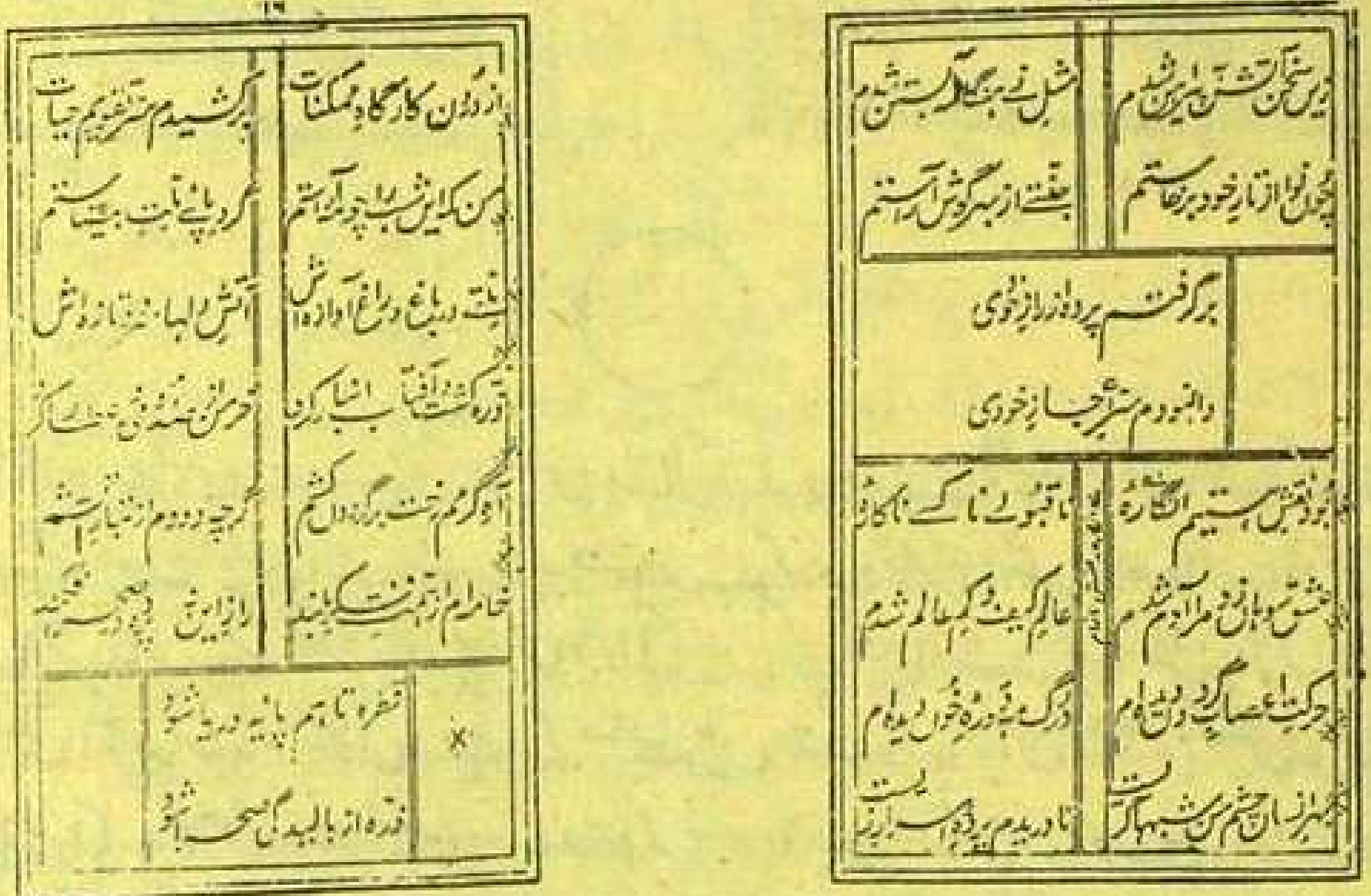

پہلے اڈیشن میں جو نظم یکجا تھی دوسرے اڈیشن میں ایک خوب صورت تناسب لانے کے لیے اقبال نے اسے دو لخت کر دیا ہے ایک حصّہ (۸ اشعار) انتساب میں برقرار ہے۔ دوسرا حصّہ (گیارہ اشعار) تمہید میں منتقل کر دیا ہے۔ یہ دونوں حصّے اوپر مکمل ثبوت کے طور پر پیش کیے جا چکے۔

اس طرح پوری نظم کا عکس آپ نے ملاحظہ کر لیا مگر مناسب تر یہ ہے کہ صداقت نامے کے طور سے اس دوسرے اڈیشن کا سرورق اور دیباچہ بھی پیش کر دیا جائے تاکہ اقبال شناسوں میں کسی قسم کا التباس یا اشتباہ آئندہ کبھی بھی راہ نہ پا سکے۔ پہلے سرورق اور پھر دیباچہ۔

مثنوی
اسرارِ خودی
یعنی
حقایقِ حیاتِ فردیہ
ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے بیرسٹر ایٹ لا
شیخ مبارک علی تاجر کتب انارکلی لاہور

دیباچہ

اس مثنوی کی پہلی ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی اب دوسری ایڈیشن میں جو اب ناظرین کی خدمت میں پیش کیجاتی ہے بعض بعض جگہ لفظی ترمیم ہے بعض جگہ اشعار کی ترتیب میں فرق ہے اور ایک دو جگہ تشریح مطالب کیلئے اشعار کا اضافہ ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اس ایڈیشن سے وہ اشعار خارج کر دیئے گئے ہیں جو جوابِ ناظرین لکھے گئے تھے۔ اگرچہ ان سے بعض ایسے اسباب کی تشفی ہوتی تھی جو خواجہ غلام الثقلین سے کوئی مذکور تھا لیکن اب خیال کرتا ہوں کہ وہ جوابات اشعار ہونے سے ان اشعار کو تقلیل کر رہے تھے جو مثنوی کے مطالب پر حاوی ہیں جن میں اس سوال پر بحث کی گئی ہے کہ میرے نزدیک کسی قوم کی تقدیر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا چاہیے۔ پہلی ایڈیشن کے ارادہ دیباچہ کی اب بھی ضروری نہیں سمجھی گئی۔

محمد اقبال

(دوسرا ایڈیشن)

ممکن ہے کسی اور سبب سے بھی اقبالؔ نے دوسرے اڈیشن کے انتساب سے یہ اشعار کم کیے ہوں لیکن ایک سبب یہ ضرور ہے کہ وہ قلمزد اشعار مطالب کو تیزی سے آگے نہیں بڑھا رہے تھے، بلکہ پوری روانی میں کچھ کھنچاوٹ، کچھ سکڑن لا رہے تھے۔

اس انتساب کو نکال دینے کے سلسلے میں متعدد کہانیاں گڑھی گئیں۔ کہانیاں گڑھنے کا ہر ایک کو حق ہے۔ لیکن سب سے زیادہ جاوید اقبال صاحب پر ہوتا ہے جنھوں نے اپنی معرکہ آرا کتاب زندہ رود میں ان کہانیوں پر اعتبار کر لیا۔ اقتباس طویل ہے مگر ہمارے لیے اس کا نقل کرنا بھی ناگزیر ہے جس کے بغیر یہ بات پوری طرح واضح نہ ہو پائے گی۔ وہ لکھتے ہیں کہ: (" زندہ رود" ص ۲۰۶)

" وسط ۱۹۱۵ء میں اسرار خودی شائع ہوئی ... یہ سر سیّد علی امام کے نام پر معنون کی گئی تھی ... اعتراض کیا گیا کہ جس کتاب میں فلسفہ خودی کی تشریح کی گئی ہو اور قوم کو خودداری کی تعلیم دی گئی ہو اسے ایک خطاب یافتہ اور دنیا دار کے نام پر معنون کیوں کیا گیا ہے۔"

اس پر جاوید اقبال نے معذرتاً لکھا ہے: (زندہ رود ص ۲۰۸)

ابتدائی ایام میں اقبال کی زبردست خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح حیدرآباد دکن کو اسلام کی دینی، فکری، علمی اور تمدنی احیا کا مرکز بنایا جائے۔ وہ خود بھی وہاں کوئی مناسب ملازمت حاصل کر کے منتقل ہونا چاہتے

تھے اور نظام کی سرپرستی میں تصنیف و تالیف کا کام کرنے کے آرزومند تھے۔ حیدرآباد کے بااثر اور علم دوست شخصیتوں سے ان کی واقفیت تھی۔ نواب میر محبوب علی خاں انتقال کر چکے تھے اور میر نواب عثمان علی خاں نظام تھے۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۱۲ء کو مہاراجا کشن پرشاد نے مدارالمہام کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور یکم دسمبر ۱۹۱۶ء تک نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ مدارالمہام رہے۔ پھر نظام نے دیوانی اور وزارت کا قلم دان خود سنبھال لیا۔ بس جس زمانے میں مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی سر سیّد علی امام حیدرآباد کے وزیراعظم نہ تھے بلکہ نظام نے خود وزارتِ عظمیٰ سنبھال رکھی تھی اور مملکت حیدرآباد بڑی تندہی سے اصلاح کی جانب گامزن تھی۔ البتہ چونکہ نظام کے لیے بیک وقت سربراہی اور وزارت میں دخل رکھنا ممکن نہ تھا، اس لیے افواہ گرم تھی کہ انگریزی حکومت سے سر سیّد علی امام کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ اقبالؔ کا یہ خیال تھا کہ اس مرحلے پر اگر سر سیّد علی امام وزیراعظم مقرر ہو گئے تو ممکن ہے کہ ریاست میں اسلام کے تمدّنی احیا کے لیے کوئی مثبت قدم اٹھایا جا سکے اسی توقع کے پیش نظر مثنوی کی اشاعت اوّلیں کو علی امام کے نام معنون کیا گیا۔ بالآخر سر سیّد علی امام کا تقرر بطور صدرالمہام ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ انھوں نے ریاستی ترقی کے لیے کئی منصوبے تیّار کیے تھے جن میں عثمانیہ یونی ورسٹی کا قیام بھی تھا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔"

معذرت میں یوں تو منشی طاہرالدین کے نام وہ خط ہی کافی تھا جو خود جاوید اقبال نے دو وجوہ میں سے ایک وجہ کے نام پر درج کیا ہے، جس میں اقبال نے سر علی کے بارے میں اپنا دل کھول کے رکھ دیا ہے۔ اقبالؔ کے بارے میں یہ تو معلوم ہی ہے کہ وہ جب کسی سے متاثّر ہوتے تھے تو پھر بے تحاشا تعریف کرنے لگتے تھے اور اس کی شخصیت کو صرف ایک خوبی میں ڈھال لیا کرتے تھے جو انھیں پسند آجاتی تھی (مثال مسولینی) اور دل کو جانے دیجیے، وہ تو سیّد سلیمان ندوی کو بھی 'استاذ کُل اور علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد' جیسے الفاظ سے مخاطب کر لیتے تھے۔ سر علی کے سلسلے میں اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے بھی اسی طرح بے تحاشا متاثر تھے، ایسا تاثر جو اسرارِ خودی، ۱۹۱۵ء سے سفر انگلستان، ۱۹۳۱ء تک قائم اور جاری رہا جب وہ ایک ہی جہاز میں گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے ہندستان کے نمایندوں کے طور سے ایک ہی جہاز میں ہمسفر تھے۔ اقبال نے اس موقع پر اپنے

خط میں لکھا ہے:[1]

"سر علی امام کو عربی فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں الولد سرّ لابیہ۔ ان کے والد ماجد مولانا نواب امداد امام اثر ادبیات اردو میں بھی خاص پایہ رکھتے تھے... گول میز کانفرنس میں سہ دو مسلمان نمائندے شاید آٹھ ہیں۔ چار مسلمان نمایندے ہیں اور چاروں مغرب زدہ۔ مغرب زدہ مسلمان کی اصطلاح شاید معارف نے وضع کی تھی نہایت پُر لطف ہے لیکن مسلمانوں کے اس مغرب زدہ قافلے کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں دو حافظ قرآن ہیں۔ یعنی نواب صاحب چھتاری اور خان بہادر ہدایت حسین۔ سیّد علی امام کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشہ جہاز پر کھڑے تھے، میں بھی ان کے ہمراہ تھا، میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے دیکھو بھائی اقبال اس وقت ہمارا جہاز ساحل مدینہ کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ یہ فقرہ ابھی پورے طور سے ان کے مُنہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی، ان کی آنکھ نمناک ہو گئی اور بے اختیار بولے بلغ سلامی روضۃ فیھا النبیّ المحترم۔ ان کے قلب کی کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ باقی رہا میں، مغرب زدہ بھی ہوں اور مشرق زدہ بھی۔ البتہ مشرقی ضرب میرے لیے زیادہ کاری ثابت ہوئی۔"[2]

یہ خط آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ ہمیں کہنا یہ ہے کہ اقبال جس وقت عالم ادب اور عالم اسلام کی نامور شخصیت بن چکے تھے اس وقت بھی ان کے دلی جذبات سر علی کے لیے اتنے ہی شدید تھے۔ حالاں کہ یہ وقت وہ تھا کہ جب خود سر علی اقبال سے تعلق رکھنے پر فخر محسوس کرتے ہوں گے۔ یہ خط جب لکھا گیا ہے اس وقت تک (۱۹۱۵) اسرار خودی کے بعد رموزِ بے خودی (۱۹۱۸) ہی نہیں پیام مشرق (۱۹۲۳ء) بانگ درا (۱۹۲۴ء) زبور عجم (۱۹۲۷) کی بھی اشاعت ہو چکی تھی۔ اور ان کی کل ہند شہرت مسلّم ہو چکی تھی۔ شاعر کے علاوہ ایک مفکّر اور متکلم اسلام کی حیثیت سے بھی انھیں لوگوں کا احترام حاصل تھا۔ فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید پر ان کے مشہور خطبے مختلف یونی ورسٹیوں اور اداروں

---

[1] جاوید اقبال: زندہ رود: ص ۲۰۷-۸ (اس خط کا مکمل متن "خطوط اقبال" مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۲۰۸-۲۱۰ پر دیکھیے۔

[2] یہ خط نقل کرتے ہوئے خود جاوید اقبال نے بھی ایک وجہ یہی لکھی تھی کہ اقبال اپنے اس دوست کے جذبۂ اسلامیت سے متاثر تھے اور انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سر سیّد علی امام اسلامی اخلاق و آداب کا بے مثل نمونہ تھے۔" (جاوید اقبال: "زندہ رود ص ۷۵)

میں ہو چکے تھے اور RECONSTITUTION کے نام سے کتابی شکل میں بھی آ چکے تھے (۱۹۳۰ء) ہندستان کے سب سے بڑے شاعر مفکر اور متکلم کی جو حیثیت انھوں نے حاصل کر لی تھی اس میں اس وقت دور دور تک اس کا کوئی سہیم و شریک نہ تھا (مولانا آزاد کی ترجمان القرآن بھی اس وقت تک سامنے نہیں آئی تھی) بڑائی کے لیے تو اتنا ہی بہت تھا لیکن انھیں تو دنیاوی بڑائیاں بھی اس عرصے میں حاصل ہو چکی تھیں۔ "سر" کا خطاب مل چکا تھا (۱۹۲۳ء) الہ آباد میں مسلم لیگ کے تاریخ ساز کل ہند اجلاس کی صدارت کر چکے تھے (۱۹۳۰ء) اور اب ۱۹۳۱ لندن کی گول میز کانفرنس کے لیے ہندستان کی ملتِ اسلامیہ کے چار بڑے نمایندوں میں سے ایک سر علی امام تھے تو ایک سر محمد اقبال۔ اور اس وقت اقبال جو خط لکھتے ہیں اس میں سر علی کے لیے وہ الفاظ ہیں جو آپ نے مندرجہ بالا خط (بنام طاہر الدین) میں ملاحظہ فرمائے۔

۱۹۱۵ء (اسرارِ خودی کا سالِ اشاعت) اور ۱۹۳۱ء (گول میز کانفرنس کے موقع سے طاہر الدین کے نام خط) کے درمیانی عرصے میں بھی سر علی امام کے لیے اقبال کے دلی جذبات و احساسات ویسے ہی پرجوش، مخلصانہ اور پرستارانہ رہے۔ یہ ۱۹۱۹ء کے اکتوبر میں لکھے گئے کشن پرشاد شاد کے نام ایک خط سے بھی ظاہر ہوتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:-

"سر سیّد علی امام اگر آپ کو اخِ معظّم کہتے ہیں تو حقیقت حال کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ نہایت نکتہ رس اور تعلّقات کو نباہنے والے آدمی ہیں۔ عام زندگی میں ان کا بے تکلّفانہ انداز اور سادگی نہایت دلفریب ہے۔"

(شاد اقبال ۱۰۷/-۱۰۸، روح مکاتیب اقبال ۲۳۲)

دراصل ہوا یہ کہ اسرارِ خودی کے اس انتساب کو صرف ایک عام سی مدحیہ نظم مان کر پڑھا گیا، پھر، پڑھا گیا، تو سمجھا نہیں گیا، اور سمجھا گیا تو فقط اتنا کہ علی امام کا قصیدہ ہے۔ ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ برّصغیر میں فارسی کا ذوق کم ہوتے جانے کے سبب اس انتساب کو ٹھیک سے پڑھا ہی نہیں گیا ہے اور لوگ بس پیش کش بحضور سر سیّد علی امام، دیکھ کر حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں کہ ملّت کا محبوب ترین شاعر پیش کش اور بحضور کے الفاظ لکھے، کچھ اور آگے بڑھتے ہیں تو ابتدائی دو شعر پڑھ کے ڈھے جاتے ہیں! اقبال نے شاید ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا:

کم نظر بے تابیِ جانم نہ دید آشکارم دید و پنہانم نہ دید

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے کہ فارسی کا ذوق کم ہوتے جانے کے سبب ہمارے

یہاں بھی بہت سی غلط فہمیاں راہ پاتی جا رہی ہیں۔ ایسی ہی ایک غلط فہمی یہاں بھی آشکارم کو نہیں سمجھا گیا، جس سے مراد اوّلین دو شعر ہیں (اے امام الخ، سلطنت را دیدہ الخ) اور پنہانم کو بھی (جس سے مراد وہ سارے بقیہ ۷ اشعار ہیں جو اقبال نے خود اپنے متعلق کہے ہیں) آیئے اب ان اشعار کو سیدھی اردو میں سمجھ لیں۔

اے اعلانسب والے سیّد (علی) امام، تو وہ ہے جس کے خاندان پر عرب کے اشراف بھی فخر کر سکتے ہیں، وہ جو سلطنت کے نظام کے لیے دیدہ افروز بن کے آیا، وہ جس نے عقلِ کُل کو حکمت سکھائی۔ تو ہے جو میرے دشوار طلب دقیق مفاہیم کا سمجھنے والا ہے اور میری شمع کے جلوے کا پروانہ بھی۔ میری فکر نے اپنی پرواز کے کتنے ہی گلستان دیکھے ہیں۔ پھر چمنستان زندگی سے کچھ پھول چن لیے، پھر ان گلوں کو تارِ رگِ جاں سے باندھا ہے۔ اب یہ گلدستہ تیرے ہاتھ میں کیسا تازہ رہے گا، میری زندگی تو تجھے معلوم ہی ہے، ایک انگارۂ ناکس و ناقبول و ناکارہ۔ عشق نے تپا کے مجھے آدمی بنا دیا اور میں ساری کائنات کا عالم ہو گیا، ایسا عالم کہ آسمان کے اعصاب تک کی حرکت دیکھ سکتا ہوں، یہ دیکھ سکتا ہوں کہ چاند کی رگوں میں خون کیسے دوڑتا ہے۔ میری آنکھوں کو انسان کے لیے آنسو بہاتے کتنی راتیں گزری ہیں تب کہیں جا کے زیست کے اسرار کا پردہ چاک ہوا ہے۔ اس ممکنات کی دنیا میں، دور تک جا کر تقویم حیات کا راز میں نے پا لیا ہے۔ میں جو اس زندگی کی رات کو چاند کی طرح آراستہ کیے ہوئے ہوں۔ ملّتِ بیضا کے لیے میری حیثیت بس اتنی ہے کہ میں اس کے پانو کی دھول ہوں، وہ ملّت جس کا باغ و راغ میں شہرہ ہے، جس کی آواز کی گونج ہے، جس کے تازہ نغمے دلوں کو گرمی بخشنے والے، دلوں میں آگ لگانے والے ہیں، وہ نغمے جنھوں نے ذرّوں کو توڑ کر آفتابوں کے انبار لگا دیے اور سیکڑوں رومی اور سیکڑوں عطّار پیدا کر دیے۔ میں تو مجسّم ایک گرم آہ ہوں، جس کا نشانہ وہ اونچا آسمان ہے۔ ایسا دھواں ہوں جس میں آگ کی تپش ہے۔ فکرِ بلند کی ہمّت کے سہارے میرے قلم نے اس نور دے والے راز کو ایسی آسمانی بلندیوں سے اتار کے صحراؤں میں بکھیر دیا (دشت از بام کردیا) تاکہ قطرہ دریا کا ہم رتبہ ہو جائے۔ ذرّہ بڑھ کر خود ہی صحرا بن جائے۔ ملّت اگر جسم ہے تو شاعر اس کی آنکھ ہے۔ اور، کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ اس جسم کے لیے اگر آبرو مندی ہے تو اس سے کہ اس کے پاس چشمِ بینا ہے اور میں ہوں وہ آنکھ! میں جو نورِ محبّت سے روشن ہوں اور جسمِ ملّی کے ہر عضو کے دکھ سے دکھی اور اشکبار۔ یہ بے قرار آنسو اور یہ گریہ ہے اختیار تیری نذر لایا ہوں، قبول ہو !!

○

پہلی نظر میں، پوری نظم میں زیادہ سے زیادہ قابلِ اعتراض شروع کے دو شعر

ٹھہرتے ہیں، ایسے نظر آتے ہیں، جو اقبال کے مرتبے کے شایاں نہیں لگتے۔ آیئے دیکھیں:
وہ سیّد تھے اور اچھے نسب کے سیّد (نواب امداد امام اثر کے صاحبزادے) سیّدوں کا خاندان نسبتِ رسالت سے عرب کے اشراف کے لیے بھی فخر کا باعث تھا اور امامؑ سر علی کا نام تھا۔ پہلے شعر میں اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور اس میں بھلا قابلِ اعتراض بات کیا ٹھہرتی ہے۔

اگلے شعر میں یہ ہے کہ سلطنت کے لیے تو دیدہ افروز ہے اور سلطنت ہند چلانے والے (عقل کُل۔ وائس رائے) کے لیے حکمت آموز! وہ شخص جو ہندستان میں سلطنت کے سربراہ وائسرائے کی کونسل کا ممبر یعنی ہندستان کا وزیر قانون ہو، وہ جس کی تحریک پر (منجملہ دوسرے محرّکوں کے) ہندستان کی عظیم سلطنت کا دارالحکومت کلکتہ سے ایک دم تبدیل ہو کے دہلی آ جائے، وہ جس کے زور ڈالنے سے اور مسلسل تحریک چلانے پر بہار و اڑیسہ کو بنگال سے الگ ایک صوبے کی حیثیت عطا کر دی جائے (۱۹۱۲ء) اور وہ جو آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں شامل رہا ہو اور بنا پڑنے کے بعد اہم ترین اجلاس امرتسر کا صدر منتخب ہوا ہو (۱۹۰۸ء) اور پھر ہندستان کی تاریخ میں ہندو مسلم اتحاد کو سب سے بڑا موڑ دینے میں جس کا ایک اہم رول رہا ہو جس کے نتیجے میں اسرارِ خودی کی اشاعت کے کچھ ہی دن بعد جب کانگریس اور لیگ کے جلسے ساتھ ساتھ منعقد ہوئے اور دونوں ملتیں لکھنؤ پیکٹ کی صورت میں ۱۹۱۶ء میں ایک قوم بن کر اُبھر آئیں، اس شخص کے واسطے سلطنت کے لیے دیدہ افروز کے الفاظ استعمال کرنا کچھ اس کی واقعی حیثیت سے آپ کو کم نہیں لگتا؟

○

اس دوسرے شعر کا دوسرا مصرع قابلِ گرفت ضرور ٹھہرتا، اگر اس مصرع کے معنی لینے کے لیے ہم بس یہیں پر رک جاتے کہ وہ (سر علی) عقلِ کُل کو حکمت سکھانے والا ہے اور 'عقلِ کُل' کے محدود اصطلاحی معنی لے لیتے۔ مزید براں یہ کہ صرف اس مصرع ہی کو پیشِ نظر رکھتے اور پہلے مصرع کو مطلقاً نظر انداز کر دیتے!

آیئے پورا شعر پھر پڑھیں: اس میں کہا گیا ہے کہ 'تو سلطنت کے لیے دیدہ افروز ہے اور عقلِ کُل کو حکمت سکھاتا ہے'، یعنی سلطنت کے عقلِ کُل (وائسرائے) کو حکمت سکھانے کی بات ہے۔

اردو کی دو مستند ترین لغات فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات ہمارے پیشِ نظر ہیں: عقلِ کُل کے معنی فرہنگِ آصفیہ کی رو سے ہیں 'دانا مشیر'، 'وہ مشیر جس کی رائے کے بغیر کوئی کام نہ کر سکیں'، اور 'مختارِ کُل' نور اللغات نے لکھا ہے 'وہ مشیر جس کے بغیر کوئی کام نہ کر سکیں'۔ مسئلہ ہندستان کا تھا اس لیے اقبال کی ہم عصر لغات کا

حوالہ دیا گیا لیکن فارسی لغات کی رو سے بھی عقلِ کُل کے معروف معنی عقلِ اوّل اور عقلِ اوّل کے قریب تر معنی اصل وحقیقتِ انسان، ہے اور یہ کہ حقیقت کی رو سے آدم صورتِ عقلِ کل ہے'! (فرہنگ آنندراج)

○

اقبال کے یہاں یہ توصیفی مبالغہ دوسرے محبوب افراد کے ساتھ بھی جا بجا دیکھا جا سکتا ہے:

ع سوے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت (مولانا محمد علی کے لیے)
ع آں کہ زد فکر بلندش آسماں را پشت پا ے (گرامی کے لیے)
ع میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا (حالی کے خیر مقدم میں، خود اپنے لیے)
ع مہدیِ آخر زماں ہم مصطفیٰ ع گفت اقبال اسمِ اعظم مصطفیٰ
(مصطفیٰ کمال کے لیے)
ع اِنّی متوفیک ورافعک اِلیّ ومطہرک (سرسیّد کی تاریخ وفات)

یعنی اقبال ایسا مبالغہ جا بجا روا رکھتے ہیں جس سے بظاہر ذہن ایک دم سے بوکھلا جائے کہ شخصِ موصوف کو کتنا بڑھا دیا، لیکن غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ حدود پھلانگی نہیں گئی ہیں، اور ہر جگہ بڑی مضبوط شاعرانہ تاویل موجود ہے۔

○

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ہم نے اس شعر کی یہ تاویل کرنے کو تو کر لی، مگر دل پورا مطمئن نہیں ہوا تھا۔ کہ اتفاق سے علی امام ہی کے لیے کہا گیا اقبال کا ایک اور شعر سامنے آگیا اور بات سلجھ گئی۔ یہ شعر اقبال نے سر علی کے ایک موقع پر لاہور آنے پر کہا تھا۔ شعر یوں ہے:

نگہدارِ حقوقِ امّت خیر البشر آیا مسلمانو! مبارک ہو امام منتظر آیا

پہلے مصرع سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ سر علی کے قدردان تھے تو اس لیے کہ سر علی نگہدار حقوق امّت خیر البشر تھے۔ لیکن دوسرا مصرع ہمارے لیے اہم تر ہے، جس میں انھوں نے سر علی کو امامِ منتظر کہا ہے کیوں کہ اسی سے پوری بات صاف ہو سکے گی۔ کسی کو امامِ منتظر کہنا مذہبی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض بات سہی لیکن شاعر اقبال کے لیے فارسی اردو شاعری کی صدیوں کی وارستگی اور آزادہ روی کی روایات کے پس منظر میں، کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، بلکہ محض ایک عام سی

شاعرانہ شوخی : امام، سر علی کا نام ہے اور منتظر وہ جس کا (لاہور آنے کا) انتظار ہو رہا تھا! اِدھر شاعرانہ شوخی مذہبی یا عوامی تصوّر، امام مہدی کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے۔

یہی امامِ منتظر والی شاعرانہ شوخی و عقل کُل را حکمت آموز آمدی، میں عقلِ کُل کی ہے۔ جس طرح اوپر درج کردہ اردو شعر میں ایک خطرناک مرکّب لفظ آ گیا ہے۔ اسی طرح یہ دوسرا خطرناک لفظ و عقلِ کُل، اس مصرع میں بھی ہے جب کہ شاعر دونوں جگہ محض شوخیِ تحریر سے کام لے رہا ہے۔

○

اقبال کے ۱۹۳۱ء کے ایک خط کی روشنی میں اس امر کی تفصیل پچھلی سطور میں آ چکی ہے کہ اقبال کا دلی تعلّق علی امام کے ساتھ ۱۹۳۱ء لندن کانفرنس کے زمانے تک پوری طرح قائم اور جاری تھا۔ علی امام کے ساتھ محمد اقبال کی دلچسپی اور وابستگی گول میز کانفرنس کے بعد بھی جاری رہی۔ یہ دلچسپی اور وابستگی یقیناً دو طرفہ ہی رہی ہوگی۔ سر علی کا اکتوبر ۱۹۳۲ء میں انتقال ہو گیا۔ مزار کی تعمیر میں دو سال لگ گئے۔ اس درمیان میں سر علی کی بی بی لیڈی انیس امام اور اقبال کے درمیان خط کتابت رہی ہوگی۔ اقبال کی طرف سے تعزیتہً کوئی خط : انیس امام کا اس کے شکریہ میں کوئی خط، اقبال کی طرف سے جواباً کوئی اور خط اور انیس امام کی طرف سے علی امام کی قبر کے کتبے کے لیے چند اشعار کی فرمایش۔ اقبال نے ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو جواباً ایک خط کے ساتھ کچھ شعر بھیجے، وہ خط انگریزی میں ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "یہ چند شعر ارسال ہیں۔ آپ ان میں سے کوئی ایک ٹکڑا منتخب فرما سکتی ہیں۔" پھر اپنے نو شعر لکھے جو سب کے سب فارسی میں ہیں، اور بڑے خوب صورت شعر ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ:

(۱) بند دروازوں کے اس گنبد (آسمان سے گھری ہوئی ہماری زمین) سے باہر جانے کے لیے میں نے راستہ بنا لیا ہے اور وہ بھی ایسے کہ ایک آہِ سحر گاہی کا سہارا لے لیا ہے جو گمان و تخیل سے بھی تیز تر اور دور تر پرواز کرتی ہے۔ جرے کہکشاں سے گزر جا، گزر جا نیلے آسمان سے !! منزل مل جائے، تو دل مر جاتا ہے، اب وہ منزل چاہے چاند ہی کی منزل کیوں نہ ہو!

(۲) میرا دل جسم و جان کے راز جانتا ہے یہ مت سمجھنا کہ موت میرے اوپر بھاری ہے۔ مجھے اس کا کیا غم کہ ایک دنیا میری آنکھ سے اوجھل ہو گئی، ابھی تو سو دنیائیں میرے اپنے ضمیر میں (پنہاں) موجود ہیں۔

(۳) دنیا کے کاروبار پر گرفت سے زندگی تھکتی نہیں ہے۔ ایک دنیا کا قصہ

تو میں نبٹا چکا، اب ایک اور دنیا کا کاروبار سنبھالنے لگا۔

(۴) کیسا خوش نصیب ہے وہ، جس نے حرم کو اپنے سینے کے اندر پہچان لیا، اور پھر بس ایک لمحے کے لیے اس کی تپش میں جلا، اور کہنے سننے کے مقام سے گزر گیا۔

(۵) عشق شور انگیز کو ہر راہ تیرے کوچے کی طرف ہی لے گئی، اب وہ اپنی تلاش پر ناز بھی کرے تو کیا، کہ جو راہ بھی جاتی ہے وہ تیری طرف ہی لے جاتی ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دل اگر دل ہے تو جس راہ پہ لے جائے گا　　درد مندوں کی وہی راہ گزر بھی ہوگی

(۶) شوق اگر زندہ جاوید نہ ہو تو مجھے بڑا عجیب سا لگے گا کہ موت آئے اور پھر یہ سمجھا جائے کہ بس اس پر آدمی کا سفر ختم ہوا! کیوں کہ تیری بات کہنے کے لیے ان دو ایک سانسوں سے تو کام چلنے سے رہا۔

(۷) اے میرے بے تھاہ سمندر، میں تو بس تیری لہروں میں رُل مل گیا ہوں، مجھے نہ موتی کی آرزو ہے اور نہ ساحل کی۔

خط میں درج اشعار کو یہاں، اقبال کے مجموعوں میں جہاں جہاں یہ قبلاً چھپ چکے ہیں ان کے حوالے کے ساتھ درج کیا جا رہا ہے۔ ایک قطعہ "پیام مشرق" سے اور ایک کے سوا باقی اشعار "زبورِ عجم" سے لیے گئے ہیں۔

(۱)

بروں زیں گنبدِ دربستہ پیدا کردہ ام راہے　　کہ از اندیشہ برتر می پرد آہِ سحر گاہے
ز جوے کہکشاں بگذر، ز نیلِ آسماں بگزر　　ز منزل دل بمیر دگر چہ باشد منزلِ ماہے

(زبورِ عجم: غزل نمبر ۳۴ ص ۹۲ / ۴ / ۱۰)

(۲)

دلِ من رازدانِ جسم و جاں است　　نہ پنداری اجل بر من گراں است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم　　ہنوز اندر ضمیرم صد جہاں است

(پیام مشرق ۱۱۱ ص ۲۳۲ / ۶۲)

(۳)

نگردد زندگانی خستہ از کار جہاں گیری　　جہانے در گرہ بستم جہانِ دیگرے پیش است

(زبورِ عجم، غزل نمبر ۴۱ ص ۴۳۶ / ۴۴)

(۴)

خوشا کسے کہ حرم را درونِ سینہ شناخت　　دمے تپید و گذشت از مقام گفت و شنود

(زبورِ عجم، غزل نمبر ۵۰ ص ۵۱۰ / ۱۱۸)

(۵)

عشقِ شور انگیز را ہر جادہ در کوے تو بُرد　　بر تلاشِ خود چہ می نازد رہ سوے تو بُرد

(زبورِ عجم غزل نمبر ۱ ص ۳۹۷ / ۵)

شوق اگر زندہ جاوید نباشد عجب است کہ حدیثِ تو دریں یک دو نفس نتواں گفت

(زبور عجم غزل نمبر ۴۴ ص ۴۳۸/۴۶)

(۷)

من اے دریائے بے پایاں بموجِ تو در افتادم نہ گوہر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را

(زبور عجم غزل ۵۱ ص ۴۴۶/۵۴)

اقبال کا یہ اہم خط ملاحظے کے لیے عکساً بھی درج ذیل ہے:-

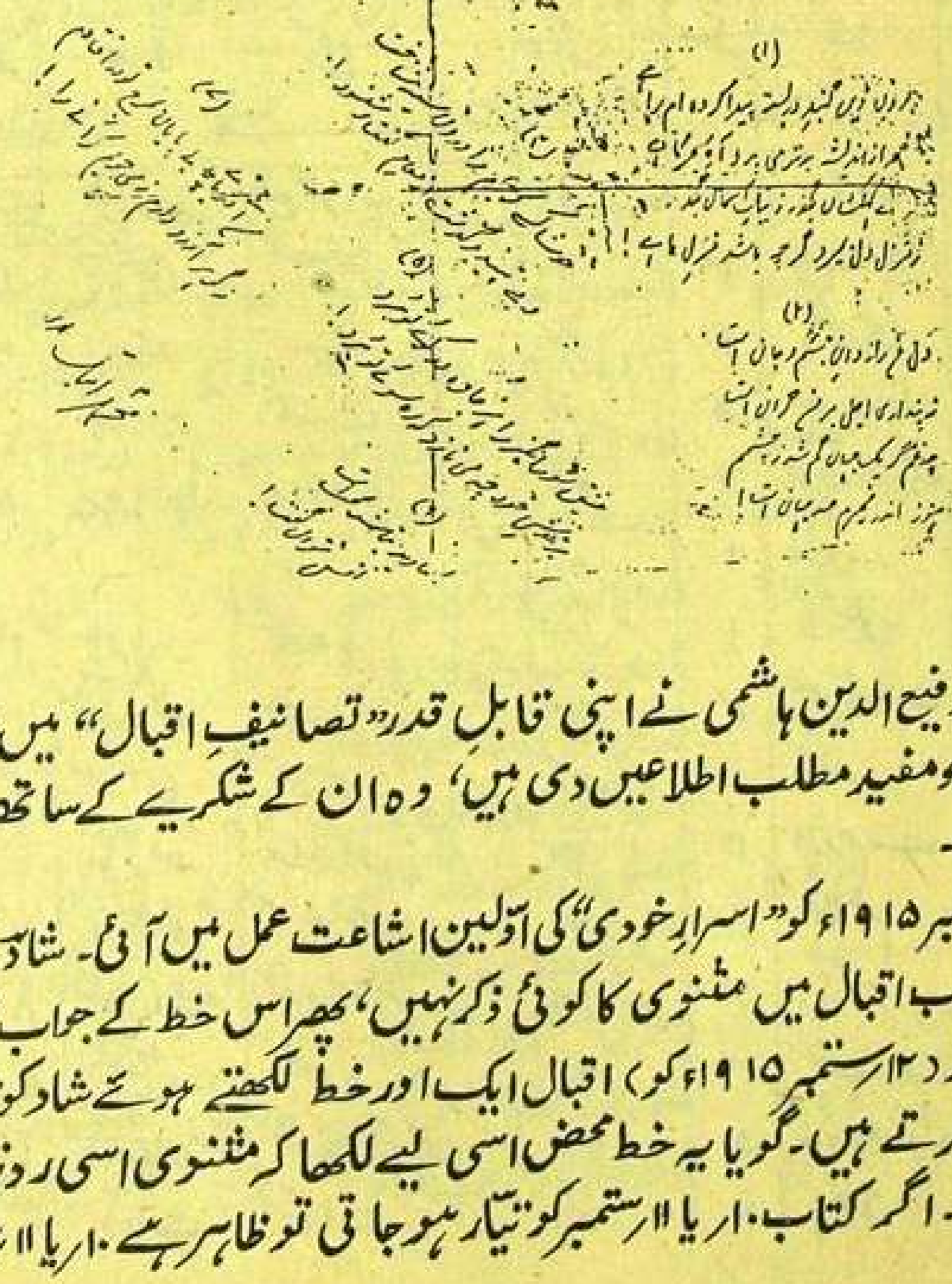

اقبال کا یہ اہم خط ملاحظے کے لیے عکساً درج ذیل ہے :-

Sir Mohd. Iqbal Kt
L.L. B. D. Litt
Barrister at Law

Lahore

Dated _____ 193

30th Dec. 1914

My dear Shad,
I'll be at first visit. You can select one of the Lessons
Yours Sincerely
Mohammad Iqbal

(۱)

ہر زماں نو می کنم دلبستہ پیدا کردہ ام را
بہ از اندیشہ برتر می پرد آہو بر نایاب

نشستن دلفگار بودن گرچہ باشد نزد ما ہے!

(۲)

دلی کز زلزہ دوراں نشد ریگ روان آباد
نہ پندارد اجل بر فرق مہ گراں آباد
چو نم گر یک جہاں گردد نشیند بر نمی خیزد
چو گوہر آنکہ گرد حادثہ جانش گراں آباد!

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی قابلِ قدر "تصانیفِ اقبال" میں اسرارِ خودی کے بارے میں جو مفید مطلب اطلاعیں دی ہیں، وہ ان کے شکریے کے ساتھ خلاصتاً نقل کی جاتی ہیں:-

● ۱۲ ستمبر ۱۹۱۵ء کو "اسرارِ خودی" کی اوّلین اشاعت عمل میں آئی۔ شاد کے نام ۹ ستمبر ۱۹۱۵ء کے مکتوب اقبال میں مثنوی کا کوئی ذکر نہیں، پھر اس خط کے جواب کا انتظار کیے بغیر چوتھے روز (۱۲ ستمبر ۱۹۱۵ء کو) اقبال ایک اور خط لکھتے ہوئے شاد کو مثنوی ارسال کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔ گویا یہ خط محض اسی لیے لکھا کہ مثنوی اسی روز مطبع سے تیار ہو کر آئی۔ اگر کتاب ۱۰ ر یا ۱۱ ر ستمبر کو تیار ہو جاتی تو ظاہر ہے ۱۰ ر یا ۱۱ ر ستمبر کو خط

لکھتے۔ اس بنا پر ہم نے تاریخ اشاعت ۱۲ ستمبر متعیّن کی ہے۔ اس کی تائید اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ طبع اوّل کے اس مجلّد نسخے سے ہوتی ہے، جس پر اقبال کے دستخط مع تاریخ (۱۵ ستمبر ۱۹۱۵ء) ثبت ہیں۔ غالباً دو تین روز کتاب کے مجلّد ہونے میں لگے۔

● پیشہ ورانہ مصروفیت اور مخصوص افتادِ طبع کی بنا پر مثنوی کی کتابت وطباعت کے ہفت خواں طے کرنا، بذاتِ خود اقبال کے لیے بہت مشکل تھا۔ چنانچہ یہ کام حکیم فقیر محمد چشتی نظامی کی نگرانی اور اہتمام میں انجام پایا، بلکہ اس کے اخراجات بھی حکیم صاحب نے برداشت کیے۔ اس خدشے کے پیشِ نظر کہ، ممکن ہے مثنوی میں زیادہ لوگ دلچسپی نہ لیں، ارادتاً اسے پانچ سو کی قلیل تعداد میں چھپوایا گیا۔ منشی فضلِ الٰہی مرغوب رقم کی کتابت قدرے جلی ہے۔ مسطر چھ سطری ہے اور سائز ۱۲×۱۵ س م دیباچے کے صفحات نمبر کا شمار الف سے ل تک کیا گیا۔ صفحہ نمبر ۱ سے متنِ اشعار کا آغاز ہوتا ہے۔ 'دو رنگا سرورق' کاپیوں سے الگ چھاپا گیا۔ پھول اور پتیوں کی بیل والے حاشیے BORDER کا رنگ سرخ ہے، جب کہ سرورق کی عبارت سبز رنگ میں ہے۔

● طبع اوّل میں املا و رکتابت کی مندرجہ ذیل اغلاط موجود ہیں:

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
سرورق	آخری	طبع گردید	طبع گردید
ج	۱۰	مستحق	مستحق
۱۰	۲	پئے	پئے
۱۶	۲	نگہت	نکہت
۲۲	۵	پروانہا	پروانہ ہا
۲۶	۱	جلوہا	جلوہ ہا
۲۶	۳	تاب نمو	تابِ نمو
۲۸	۶	موسی	موسیٰ
۵۶	۲	ماؤاو	ماو او
۵۶	۴	از حویش	از خویش
۵۶	۵	خون آشام	خوں آشام
۵۶	۶	نحسؑ	نحسِ
۵۸	۱	ضعیفاں خسراں	ضعیفانِ خسران
۷۸	۱	دولتِ	دولت

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۶	۴	ببروں	بیروں
۲۰	۴	حیات۔ تعینات	حیات و تعینات
۲۲	۴	شبیرین	شبیریں
۲۳	۵	پروانہا مصرع اوّل	پروانہا
۷۹	۶	ہجرت آموزِ طن	ہجرتِ آموزِ وطن
۸۱	۱	الٰہی	الٰہی
۸۱	۱	لا یبلی	لا یبلیٰ
۱۱۴	۴	صحراؤدشت	صحرا و دشت
۱۱۵	۴	آذر	آزر
۱۱۶	۵	ازرم ست	ازرم است
۱۱۹	۱	طلاطم	تلاطم
۱۳۰	۱	آگرہ	آگہی
۱۳۲	۴	نعمہاے	نغمہ ہاے
۱۳۳	۵	جادیدنیست	جاوید نیست
۱۴۸	۶	بالاؤ	بالا و

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۸	۲	ماوطیں	ماءوطین	۱۵۵	۲	ایں واں	این و آں
۷۸	۳	لا اِلٰہ	لا اِلٰہَ	۱۵۵	۵	آذرش	آزرش

● اگلے اڈیشن کی اشاعت ۱۹۱۸ء کے نصف آخر میں عمل میں آئی۔ طبع اوّل کے مندرجات سرورق میں بھی ترمیم کی گئی ہے۔ کتاب کے نام کے ساتھ "یعنی حقائق حیات فردیہ" کے الفاظ بڑھا دیے گئے ہیں۔

اس اڈیشن کا سب سے اہم پہلو وہ محذوفات و اضافات ہیں، جو علامہ اقبال نے "اسرار خودی" پر تبصروں اور تنقیدوں کی روشنی میں کیے۔ بعض ترامیم بھی کی گئیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

محذوفات:

(۱) سرورق: پیشانی پر مندرج آیتِ قرآنی: اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً۔

(۲) بارہ صفحات کا دیباچہ۔

(۳) ایک شعر: روح نومی جوید اجسام کہن۔ کمتر از قُم نیست اعجازِ سخن

ترمیم نمبر	صفحہ کلیات	صفحہ	اسرارِ خودی طبعِ اوّل	صفحہ	اسرارِ خودی، طبع دوم
۲۳	۴۱	۷۵ ع	رقص پیرا در رگِ او خونِ او	۶۷ ع	بر جہد اندر رگِ او خونِ او
۲۴	۴۱	۷۶ ع	از حدودِ زندگی بیروں مرو	۶۸ ع	از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو
۲۵	۴۶	۸۷ ع	پس بآلامِ جہاں سازیم ما	۷۶ ع	پس بہ سوزِ ایں جہاں سازیم ما
۲۶	۴۷	۸۸ ع	در ریاضِ او چو بو آوارہ ام	۷۷ ع	در خیابانش چو بو آوارہ ام
۲۷	۴۸	۸۹ ع	دیدہ اعمیٰ گوشِ ناشنوا ازو	۷۸ ع	چشم کور و گوشِ ناشنوا ازو
۲۸	۴۸	۹۰	در جہاں ہر فتح از کرّاری است	۷۹	مرد کشور گیر از کرّاری است
۲۹			آبروئے مرد از خودداری است		گوہرش را آبرو خودداری است
۳۰	۴۹	۹۲	در عمل مخفی است مضمونِ حیات	۸۰	در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات
۳۱			ذوقِ تخلیق است قانونِ حیات	۸۱	لذتِ تخلیق قانونِ حیات
۳۲	۴۹	۹۳ ع	ہمتش را از مہماتِ عظیم	۸۲ ع	زورِ خود را از مہماتِ عظیم
۳۳	۵۰	۹۵	مدّعی گر صاحبِ قوت بود	۸۴	مدّعی گر مایہ دار از قوت است
۳۴			دعویش مستغنی از حجت بود		دعویِ او بے نیاز از حجت است
۳۵	۵۲	۹۸ ع	قلزمے در قطرۂ مضمر کنم	۸۶ ع	گلشنے در غنچۂ مضمر کنم
۳۶	۵۸	۱۱۲ ع	غوطہ خوارِ قلزم بود و عدم	۹۶ ع	سر فرو اندر یم بود و عدم

ترمیم نمبر	صفحہ کلیات	صفحہ	اسرار خودی، طبع اوّل	صفحہ	اسرار خودی، طبع دوم
۳۷	۶۰	۱۱۶ع	صد شرار از سینۂ خارا برید	۱۰۰ع	ہم چو بحر آتش از کیں بر دمید
۳۸	۶۱	۱۱۹	از تو قلزم سائل طوفاں شود	۱۰۲	از تو قلزم گریۂ طوفاں کند
۳۹			شکوہ سنجِ تنگیٔ داماں شود		شکوہ ہا از تنگیٔ داماں کند
۴۰	۶۷	۱۳۲ع	التہاب دل خسِ ادراک سوخت	۱۱۳ع	آتشِ دل خرمنِ ادراک سوخت
۴۱	۶۹	۱۳۶ع	شعلہ ہائے او مثالِ ژالہ سرد	۱۱۶ع	شعلۂ دارد مثالِ ژالہ سرد
۴۲	۷۴	۱۴۶	عصرِ نو کز جلوہ ہا آراستہ است	۱۲۴	عصرِ نو از جلوہ ہا آراستہ
۴۳			از غبارِ پائے ما برخاستہ است		از غبارِ پائے ما برخاستہ
۴۴	۷۶	۱۴۹ع	ما پریشاں چوں ہجومِ اختریم	۱۲۸ع	ما پریشاں در جہاں چوں اختریم

---

(۴) ایک شعر

زندگی محکم ز ایقاظِ خودی است — کاہد از خوابِ خودی نیروے زیست

(طبع اوّل ص ۲۷)

(۵) حافظ کے بارے میں ۳۵ اشعار، پہلا شعر یہ ہے:

ہوشیار از حافظ صہبا گسار — جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار

(طبع اوّل: ص ۶۶-۷۲)

(۶) چار اشعار:

۱۔ صورتِ منصور اگر خود بیں شوی — ہمچو حق بالاتر از آئیں شوی

۲۔ سوز مضمون دفترِ منصور سوخت — جلوہ رقصید و متاعِ طور سوخت

۳۔ رفت از تن روحِ گردوں تاز او — از اجل بیگانہ ماند آوازِ او

۴۔ نعرہ اش در لب چو گویائی ندید — سر بر دل از قطرۂ خونش کشید

(طبع اوّل: ص ۱۰۶-۱۰۷)

(۷) ایک شعر:

پختگیہا جست و خود آگاہ شد — زینتِ پہلوے بیت اللہ شد

(طبع اوّل: ص ۱۱۱)

(ب) اضافات

(۱) سرورق کی پیشانی پر ۷۸۶۔ (۲) سرورق پر "مثنوی اسرار خودی" کے الفاظ کے بعد "یعنی حقائق حیاتِ فردیہ"۔ (۳) طبع دوم کا نیا دیباچہ۔ (مقالاتِ اقبال میں منقول ہے مگر اس میں متعدد اغلاط موجود ہیں۔) (۴) رومی کے تین اشعار: دی شیخ با چراغ... (طبع دوم: ص ۲) (۵) آغاز مثنوی سے قبل تسمیہ سے اوپر کی سطر میں: "ھُوَ" (طبع دوم: ص ۵) (۶) نظیری

کا شعر: نیست در خشک و تر... (طبع دوم: ص ۵) (۷) ایک شعر: چوں خودی آرد... (طبع دوم ص ۲۳) (۸) مکمل باب بہ عنوان: "در حقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ" مع حواشی (طبع دوم: ص ۵۵-۶۴) (۹) پانچ اشعار۔ از شعر نمبر ۱: گر نہ سازد... تا شعر نمبر ۵: در جہاں نتواں... (طبع دوم ص ۸۱ کلیات ص ۴۹۔ (۱۰) مولانا روم کا ایک شعر بہ تغیّرِ الفاظ مع حاشیہ در درونم سنگ... (طبع دوم: ص ۱۰۱) (۱۱) ایک شعر مع حاشیہ: "تا کجا در روز و شب... (طبع دوم: ص ۱۲۲ (۱۲) ایک شعر: کوہ آتش خیز کن... (طبع دوم: ص ۱۲۹) (۱۳) ایک شعر: باز مارا بر جہاں... (طبع دوم: ص ۱۲۹) (۱۴) جملہ حواشی سوائے دو مقامات کے: ۱۔ (طبع دوم: ص ۷۹) ۲۔ (طبع دوم) ص ۱۱۲) (۱۵) آخری صفحے پر کاپی رائٹ سے متعلق "اعلان" کے آخر میں مصنّف کے دستخط بہ حروفِ انگریزی مع "بیرسٹرایٹ لا۔ لاہور"۔

(ج) ترامیم:

ترمیم نمبر	صفحہ کلیات	صفحہ	اسرارِ خودی، طبع اوّل	صفحہ	اسرارِ خودی، طبع دوم
۱	۹	۱۴	شمع شبخوں ریخت بر پروازِ ام	۱۲	شمع سوزاں تافت بر پروازِ ام
۲			بادہ یورش کرد بر پیمانہ ام		بادہ شبخوں ریخت بر پیمانہ ام
۳	۱۴	۲۵ ع	جنبش از مادام گیر د جام مے	۲۱ ع	گردش از مادام گیر د جام مے
۴	۱۴	۲۵ ع	شکوہ سنجِ یورشِ دریا شود	۲۲ ع	شکوہ سنجِ جوششِ دریا شود
۵	۱۴	۲۶ ع	سبزہ چوں تابِ نمود از خویش یافت	۲۲ ع	سبزہ چوں تابِ دمید از خویش یافت
۶	۱۶	۳۰	نے گرفت از نیستاں آئینِ خویش	۲۵	نے بروں از نیستاں آباد شد
۷			نغمہ زد از لذتِ تعیینِ خویش		نغمہ از زندانِ او آزاد شد
۸	۱۶	۳۰	چیست رازِ اختراعاتِ علوم	۲۶	چیست رازِ تازگیہائے علوم
۹	۱۹	۳۵ ع	از حسینانِ جہاں محبوب تر	۲۹ ع	خوش تر و زیبا تر و محبوب تر
۱۰	۲۰	۳۸ ع	چوں نبی دختر چہ را بے پردہ دید	۳۱	دخترک را چوں نبی بے پردہ دید
۱۱	۲۱	۴۰ ع	در تپیدِ متصل آرامِ من۔	۳۳ ع	در تپید و مبدم آرامِ من
۱۲		۴۳	جملہ استقامِ تو از ناداری است	۳۶	خستگیہائے تو از ناداری است
۱۳	۲۳		اصل علت ہا ہمیں بیماری است		اصلِ دردِ تو ہمیں بیماری است
۱۴	۲۶	۵۰ ع	غرق اندر قلزمِ افکارِ خویش	۴۱ ع	غوطہ زن اندر یمِ افکارِ خویش
۱۵	۲۶	۵۱ ع	نامۂ آں صوفیٔ حق دستگاہ	۴۳ ع	نامۂ آں بندۂ حق دستگاہ
۱۶	۲۹	۵۶ ع	رنگ سبعیت پذیرد گوسفند	۴۶ ع	خوئے گرگی آفریند گوسفند
۱۸	۳۰	۵۸	تازِ فیضِ نیّرے تاباں شوی	۴۸ ع	تازِ نورِ آفتابے بر خوری
۱۹	۳۰	۵۹	قومِ شیراز فتح پیہم خستہ بود	۴۹	خیلِ شیراز سخت کوشی خستہ بود
۲۰			دل بذوقِ استراحت بستہ بود		دل بذوقِ تن پرستی بستہ بود

ترمیم نمبر	صفحہ کلیات	صفحہ	اسرارِ خودی، طبع اول	صفحہ	اسرارِ خودی طبع دوم
۲۱	۳۱	۵۹	آمدش ایں وعظِ خواب آور پسند	۴۹	آمدش ایں پندِ خواب آور پسند
۲۲			گشت مسحور از کلام گوسفند		خورد از خامی فسونِ گوسفند
۴۵	۷۷	۱۵۲	آفتاب از فیضِ او گردوں مقام	۱۳۰	آفتاب از سوزِ او گردوں مقام
۴۶			بر قہا محوِ طوافِ او مدام		بر قہا اندر طوافِ او مدام
۴۷	۷۸	۱۵۴ ع	در ہجومِ عالمے تنہا ستم	۱۳۲ ع	در میانِ محفلے تنہا ستم

● بعض مقامات پر ترتیبِ اشعار و مصاریع میں تقدیم و تاخیر کی گئی ہے:

(الف) طبع اول (ص: ۲۴) میں یہ شعر: خیز و انگیز...

اس بند کا آخری شعر تھا۔ طبع دوم (ص: ۲۰) میں اسے موجودہ جگہ لایا گیا۔

(ب) دو اشعار: آرزو را در دلِ خود... اور: آرزو جانِ جہاں...

(طبع اوّل ص: ۳۲ میں اس باب کے آخری شعر تھے، طبع دوم ص: ۳۴ میں انھیں باب کا شعر نمبر ۳ اور نمبر ۴ بنا دیا گیا۔)

(ج) طبع اوّل (ص: ۹۸) میں اس شعر:

خاکِ پنجاب از دمِ او زندہ گشت صبحِ ما از مہرِ او تابندہ گشت

کے مصرعوں کی ترتیب، موجودہ صورت کے برعکس تھی۔ طبع دوم (ص: ۸۲) میں یہ ترتیب قائم کی گئی۔

(۳) طبع اوّل (ص: ۶۲) میں ایک عنوان کی ابتدائی صورت یہ تھی:

در بیان اینکہ افلاطونِ یونانی و حافظ شیرازی کہ تصوّف و ادبیات اقوام اسلامیہ از تخیّلاتِ ایشاں اثر عظیم پذیرفتہ بر مسلک گوسفندی رفتہ اند و از ایشاں احتراز واجب است۔

طبع دوم (ص ۵۱) میں اسے موجودہ صورت دی گئی (یعنی: در معنی اینکہ افلاطونِ یونانی کہ تصوّف و ادبیاتِ اقوام اسلامیہ از افکار او اثر عظیم پذیرفتہ بر مسلکِ گوسفندی رفتہ است و از تخیّلات او احتراز واجب است)

●●

اسرارِ خودی

(فراموش شدہ اڈیشن)

حکسی

پہلا اڈیشن اور دوسرا اڈیشن

جملہ حقوق محفوظ

انّ من الشعر لحکمۃ

مثنوی

اسرارِ خودی

از

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بیرسٹر ایٹ لا

باہتمام حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی

در یونین سٹیم پریس لاہور طبع کردہ

بار اول تعداد ۵۰۰

دیباچہ

یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں یہ پُراسرار شئے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بندی ہے۔ یہ "خودی" یا "آنا" یا "میں" جو اپنے عمل کے رُو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کے رُو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور

یہی وجہ ہی کہ دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جسکے حکما و عُلما نے کسی نہ کسی صُورت
میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا
جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر
کہ انکی افتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی
طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریبِ تخیل ہی اور اس پھندے کو
گلے سے اُتار دینے کا نام نجات ہی۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق انکو ایسے
نتائج کی طرف لیگیا جسکے لئے انکی فطرت متقاضی تھی۔

ہندو قوم کے دِل و دماغ میں عملیات و نظریات کی ایک عجیب طریق
سے آمیزش ہوئی ہی اس قوم کے متوشگاف حکما نے قوتِ عمل کی حقیقت
پر نہایت دقیق بحث کی ہی۔ اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انا
کی حیات کا یہ مشہودِ تسلسل جو تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے عمل سے

متعین ہوتا ہی۔ یا یوں کہئے کہ انسانی انا کی موجودہ کیفیات اور لوازمات
اسکے گذشتہ طریق عمل کے لازمی نتیجہ ہیں اور جب تک یہ قانونِ عمل اپنا کام
کرتا رہیگا وہی نتائج پیدا ہوتے رہینگے۔ اُنیسویں صدی کے مشہور
جرمن شاعر گوئٹے کا ہیرو فوسٹ جب انجیل یوحنا کی پہلی آیت میں لفظ
کلام کی جگہ لفظِ عمل پڑھتا ہی (ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ
اور کلام ہی خدا تھا) تو حقیقت میں اس کی دقیقہ رس نگاہ اسی نکتے
کو دیکھتی ہی جسکو ہندو حکما نے صدیوں پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس عجیب و
غریب طریق پر ہندو حکما نے تقدیر کی مطلق العنانی اور انسانی حریت
یا بالفاظِ دیگر جبر و اختیار کی گتھی کو سلجھایا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ
فلسفیانہ لحاظ سے انکی جدت طرازی داد و تحسین کی مستحق ہی۔ اور
بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ ایک بہت بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ

ان تمام فلسفیانہ نتائج کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قضیّہ سے پیدا ہوتے ہیں یعنی یہ کہ جب انا کی تعیین عمل سے ہو تو انا کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ ترکِ عمل ہے۔ یہ نتیجہ انفرادی اور ملی پہلو سے نہایت خطرناک تھا اور اس بات کا مقتضی تھا کہ کوئی مجدد پیدا ہو جو ترکِ عمل کے اصلی مفہوم کو واضح کرے۔ بنی نوع انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائیگا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترکِ کلّی نہیں ہے۔ کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے۔ بلکہ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دلبستگی نہ ہو۔ سری کرشن کے بعد سری

رام نوج بھی اسی رستے پر چلے مگر افسوس ہے کہ جس عروس معنی کو سری کرشن اور سری رام نوج بے نقاب کرنا چاہتے تھے سری شنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا اور سری کرشن کی قوم انکی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی۔

مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغام عمل تھی گو اس تحریک کے نزدیک انا ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے۔ مگر مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتہ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی۔ اسی نکتہ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔

شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جسکے وہ اَن تھک مفسر تھے اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا اوحدالدین کرمانی اور فخرالدین عراقی اُن کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعراء اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل و ماغی مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ اُنہوں نے جزو اور کل کا دشوار گذار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے "رگِ چراغ" میں "خونِ آفتاب" کا اور "شرارِ سنگ" میں "جلوہ طور" کا بلاواسطہ مشاہدہ کیا۔

مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا۔ مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک

طریق اختیار کیا یعنی اُنہوں نے دِل کو اپنا آماجگاہ بنایا اور انکی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخرکار یہ نتیجہ ہُوا کہ اس مسلے نے عوام تک پہنچکر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔ عُلماء قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ اور حکما میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے اِحتجاج بلند کی مگر افسوس ہے کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ مُلا محسن فانی کشمیری نے اپنی کتاب دبستانِ مذاہب میں اس حکیم کا تھوڑا سا تذکرہ لکھا ہے جس سے اس کے خیالات کا پُورا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دلربائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

شعراء میں شیخ علی حزین نے یہ کہکر کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است"

اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ حقیقتِ حال سے آگاہ تھے مگر باوجود اس بات کے انکا کلام شاہد ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اِن حالات میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تخیل اپنے عملی ذوق کو محفوظ رکھ سکتا۔ مرزا بیدل علیہ الرحمۃ لذتِ سکون کے اِس قدر دلدادہ ہیں کہ ان کو جنبشِ نگاہ تک گوارا نہیں

"نزاکت ہا است در آغوشِ مینا خانۂ حیرت
قرہ بر ہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را"

اور امیر مینائی مرحوم تعلیم دیتے ہیں کہ

"دیکھ جو کچھ سامنے آجائے مُنہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا"

مغربی اقوام اپنی قوتِ عمل کیوجہ سے تمام اقوامِ عالم میں ممتاز ہیں

اوسی وجہ سے اسرارِ زندگی کو سمجھنے کے لئے انکے ادبیات و تخیلات اہل مشرق کے واسطے بہترین رہنما ہیں۔ اگرچہ مغرب کے فلسفۂ جدید کی ابتدا ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی کے نظامِ وحدت الوجود سے ہوتی ہے لیکن مغرب کی طبائع پر رنگِ عمل غالب تھا۔ مسئلہ وحدت الوجود کا یہ طلسم جسکو ریاضیات کے طریق استدلال سے پختہ کیا گیا تھا دیر تک قائم نہ رہ سکتا تھا۔ سب سے پہلے جرمنی میں انسانی انا کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا اور رفتہ رفتہ فلاسفۂ مغرب بالخصوص حکمائے انگلستان کے عملی ذوق کی بدولت اس خیالی طلسم کے اثر سے آزاد ہوگئے جس طرح رنگ بو وغیرہ کے لئے مختص حواس ہیں اسی طرح انسان میں ایک اور حاسہ بھی ہے جسکو حسِّ "واقعات" کہنا چاہیئے۔ ہماری زندگی واقعاتِ گردوپیش کے مشاہدہ کرنے اور انکے صحیح مفہوم کو سمجھکر عمل

پیرا ہونے پر منحصر ہے مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو اس قوت سے کام لیتے ہیں جس کو ہم نے حس واقعات کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے؟ نظامِ قدرت کے پر اسرار بطن سے واقعات پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے مگر بیکن سے پہلے کون جانتا تھا کہ یہ واقعاتِ حاضرہ جنکو نظریات کے دلدادہ فلسفی اپنے تخیل کی بلندی سے بنگاہِ حقارت دیکھتے ہیں اپنے اندر حقائق و معارف کا ایک گنج گرانمایہ پوشیدہ رکھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ انگریزی قوم کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دُنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں "حسِ واقعات" اور اقوامِ عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی "دماغ بافتہ" فلسفیانہ نظام جو واقعات متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہو سکتا ہو۔ انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں ادبیات

عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و
دماغ ان سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کریں
یہ ہے ایک مختصر خاکہ اس مسئلے کی تاریخ کا جو اس نظم کا موضوع
ہے۔ میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے
آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ
اس کی حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔
اس دیباچے سے اس نظم کی تفسیر مقصود نہیں۔ محض ان لوگوں
کو نشانِ راہ بتانا مقصود ہے جو پہلے سے اس عسیر الفہم حقیقت
کی دقتوں سے آشنا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سطورِ بالا سے کسی حد
تک یہ مطلب مکمل آئیگا۔ شاعرانہ پہلو سے اس نظم کے متعلق کچھ کہنے
کی ضرورت نہیں۔ شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کے تعریف

توجہ دلانے کا کہ لذتِ حیات انا کی انفرادی حیثیت اس کے اثبات
استحکام اور توسیع سے وابستہ ہی۔ یہ نکتہ مسئلہ حیات ما بعد الموت
کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے بطور ایک تمہید کے کام دیگا +

ہاں لفظِ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہی کہ یہ لفظ
اس نظم میں معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل
ہی۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعین ذات ہی۔ مرکب لفظ بیخودی
میں بھی اس کا یہی مفہوم ہی اور غالباً محسن تاثیر کے اس شعر میں بھی لفظ
خودی کے یہی معنی ہیں ؎

غریقِ قلزمِ وحدت دمِ از خودی نزند بود محال کشیدن میانِ آب نفس"

محمد اقبال

پیشکش

بحضورِ سیّد علی امام مدظلہ العالی

اے امام با اے سیّدِ الانسب
دُودمانت فخرِ اشرافِ عرب

سلطنت را دیدہ افسر وزر آمدی
عقلِ کُل را حکمت آموز آمدی

آشنائے معنیٔ بیگانۂ
جلوۂ شمعِ مرا پروانۂ

مُرغِ فکرم گُلستانہا دیدہ است
از ریاضِ زندگی گُل چیدہ است

ایں گُل از تارِ رگِ جاں بستہ ام
تازہ تر در دستِ تو گُلدستہ ام

بُود نقشِ ہستیم انگارۂ
تا قبُولے ناکسے ناکارۂ

عشقِ سوہاں زد مرا آدم شدم
عالمِ کیف و کمِ عالم شُدم

حرکتِ اعصاب گردُوں دیدہ ام
در رگِ مہ دورۂ خُوں دیدہ ام

بهرِ انسان چشمِ من شبها گریست
تا دریدم پردهٔ اسرارِ زیست

از درونِ کارگاهِ ممکنات
بر کشیدم سرِّ تقویمِ حیات

من که این شب را چو مه آراستم
گردِ پایِ ملّتِ بنپاستم

ملّتے در باغ و راغ آوازه‌اش
آتشِ دلها سرودِ تازه‌اش

ذرّه کشت و آفتاب انبار کرد
خرمنِ من از صدِ رومی عطار کرد

آهِ گرمم رخت بر گردون کشید
گرچه دودم از تبارِ آتشم

خامه‌ام از همّتِ فکرِ بلند — رازِ این نه پرده در صحرا فگند

قطره تا هم پایهٔ دریا شود — ذرّه از بالیدگی صحرا شود

ملّت ار جسم است شاعر چشم او — جسم را از چشم بیناآبرو ست

چشمم از نورِ محبّت روشنم — اشکبار از دردِ عضوانتم

نذرِ اشکِ بیقرار از من پذیر!

گریهٔ بی اختیار از من پذیر!

بسم الله الرحمن الرحیم

تمهید

راهِ شب چون مهرِ عالمتاب زد | گریهٔ من بر رخِ گل آب زد
اشکِ من از چشمِ نرگس خون گشت | سبزه از هنگامه ام بیدار رست

باغبان زورِ کلامم آزمود
مصرعے کارید و شمشیرے درود

در چمن جز دانهٔ الم نکشت
تار و پودِ نغمه‌ام جز زخم نیست

ذرّه‌ام مهرِ منیر آئینِ من است
صد سحر اندر گریبانِ من است

خاکِ من روشن‌تر از جامِ جم است
محرم از نازادهائے عالم است

فکرم آن آهو سرِ فتراک بست
کو هنوز از نیستی بیرون نجست

سبزهٔ نارُسته از بیمِ خزان
گل بشاخ اندر نهان دارد منم

محفلِ آشفتگی را هم زدم
زخمه بر تارِ رگِ عالم زدم

بسکه عودِ فطرتم نادرنواست
هم‌نشینِ از نغمه‌ام ناآشناست

در جهانِ خویش نوزائیده‌ام
رسم و آئینِ فلک نادیده‌ام

رم ندیده‌ام از تایم هنوز
هست ناآشفته سیمابم هنوز

بحر از رقصِ ضیایم بی‌نصیب
کوه از رنگِ حنایم بی‌نصیب

خوگرِ من نیستِ چشمِ هست‌بود
لرزه بر تن خیزم از خوفِ نمود

بامم از خاور رسید و شب شکست
شبنمِ نو بر گلِ عالم نشست

انتظارِ صبح خیزاں میکشم
اے خوشا زرتشتیانِ آتشم

بے نیاز از گوش امروز آمدم
من صدائے شاعرِ فرداستم

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست
یوسفِ من بہرِ این بازار نیست

نا امید استم زِ یارانِ قدیم
طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

قلزمِ یاراں چو شبنم بے خروش
شبنمِ من مثلِ یم طوفاں بدوش

نغمه من از جهانِ دیگر است
این جرس را کاروانِ دیگر است

ای بسا شاعر که بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد

رخت باز از نیستی بیرون کشید
چون گل از خاکِ مزارِ خود دمید

کاروانها گرچه زین صحرا گذشت
مثلِ گامِ ناقه کم غوغا گذشت

عاشقم فریاد ایمانِ من است
شورِ حشر از پیشخیزانِ من است

نغمه‌ام را اندازه تار است کیست
من نه‌ترسم او شکستِ عودِ خویش

قطره از سیلابِ من بیگانه به
قلزم از آشوبِ او دیوانه به

در نمی گنجد بجو عمّانِ من
بحرها باید پیِ طوفانِ من

غنچه کز بالیدگی گلشن نشد
در خورِ ابرِ بهارِ من نشد

برقها خوابیده در جانِ من است
کوه و صحرا باب جولانِ من است

پنجه کن با بحرِ من ار صحرا شوی
برقِ من در گیر اگر سینا شوی

چشمهٔ حیوان براتم کرده اند
محرمِ راز حیاتم کرده اند

ذرّه از سوزِ نوایم زنده گشت
تا پرَ کشود و کرمکِ تابنده گشت

هیچکس رازے که من گویم نگفت
همچو فکرِ من دُرِ معنی نسُفت

سرِّ عیشِ جاودان خواهی بیا
هم زمین هم آسمان خواهی بیا

پیرِ گردُوں با من ایں اسرار گفت
از ندیماں کس ازیں نتوان نهُفت

ساقیا برخیز و مے در جام کُن
محوِ از دِل کاوشِ ایّام کُن

شعلۂ آبے کہ اصلش زمزم است
اگر گدا باشد پرستارش حرم است

می کند اندیشہ را ہشیار تر
دیدۂ بیدار را بیدار تر

اعتبارِ کوہ بخشد کاہ را
قوّتِ شیراں دہد روباہ را

خاک را اوجِ ثریّا می دہد
قطرہ را پہنائے دریا می دہد

خامشی را شورشِ محشر کند
پائے کبک از خون ما رنگیں کند

خیز و در جامِ مے ناب ریز
در شبِ اندیشہ ام مہتاب ریز

تا سوئے منزلِ کشم آوارہ را
ذوقِ بیتابی دہم نظارہ را

گرم رو از جستجوئے نو شوم
روشناسِ آرزوئے نو شوم

چشمِ اہلِ ذوق را مرہم شوم
چوں صدا در گوشِ عالم گم شوم

قیمتِ جنسِ سخن بالا کنم
آبِ چشمِ خویش در کالا کنم

باز برخوانم ز فیضِ پیر رُوم
دفترِ سربستۂ اسرارِ علوم

جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار
من فروغِ یک نفس مثلِ شرار

شمع شبخون ریخت بر پروانه‌ام
باده یورش کرد بر پیمانه‌ام

پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوه‌ها تعمیر کرد

ذره از خاک بیابان رخت بست
تا شعاع آفتاب آرد بدست

موجم و در بحر او منزل کنم
تا دُر تابنده حاصل کنم

من که مستیها ز صهبایش کنم
زندگانی از نفسهایش کنم

شب دلِ من مائلِ فریاد بود — خامشی از یار بم آباد بود

شکوه آشوبِ غمِ دوران مدم — از تهی پیمانگی نالان بدم

این قدر نظاره ام مشتاق شد — بال و پر شکست و آخر خواب شد

روی خود بنمود پیرِ حق سرشت — گو بحرفِ پهلوی قرآن نوشت

گفت اے دیوانهٔ ارباب عشق — جرعه گیر از شرابِ ناب عشق

بر جگر هنگامه محشر بزن — شیشه بر سر دیده بر شتر بزن

خنده را سرمایهٔ صد ناله ساز
اشکِ خونین را جگر پاره ساز

تا کی چون غنچه می باشی خموش
نگهتِ خود را چو گل زر افشان و فروش

در گره هنگامه داری چون سپند
محملِ خود بر سرِ آتش بند

چون حرس آخر زهر حرزِ بدن
نالهٔ خاموش را بیرون فگن

آتشی انشی بزم عالم برفروز
دیگران را هم ز سوزِ خود بسوز

فاش گو اسرار پیرِ می فروش
موج می شو گسوتِ مینا بپوش

سنگ شو آئینهٔ اندیشه را
بر سر بازار بشکن شیشه را

از میستان همچو نے پیغامه
قیس را از قومِ کے پیغامه

آله را اندازِ نو ایجاد کن
بزم را آزادهای هموآباد کن

روحِ نو می جوید اجسامِ کهن
کمتر از قم نسبت اعجازِ سخن

خیز و جانِ نو بده هر زنده را
از قمِ خود زنده تر کن زنده را

خیز و پا بر جادهٔ دیگر بنه
جوشِ سودائے کهن از سر بنه

آشنائے لذّتِ گفتار شو
ای درائے کاروان بیدار شو

زین سخن آتش بہ پیرہن شدم
مثلِ نے در ہنگامہ السّتن شدم

چون نوا از تارِ خود بر خاستم
جذبتے از بہر گوش آراستم

بر گرفتم پردہ از رازِ خودی
تا نمودم سرِّ اعجازِ خودی

شاعریٰ زین مثنوی مقصود نیست
بت پرستی بت گری مقصود نیست

هندیم از پارسی بیگانه‌ام
ماه نو باشم تهی پیمانه‌ام

حسن اندازِ بیان از من مجو
خوان شکر و اصفهان از من مجو

گرچه هندی در عذوبت شکّر است
طرزِ گفتارِ دری شیرین‌تر است

فکرِ من از جلوه‌اش مستحور گشت
خامهٔ من شاخِ نخلِ طور گشت

دیده از خاکِ عجم نورانی است
لاجرم طرزِ نگه تورانی است

پارسی از رفعتِ اندیشه‌ام
در خورد با فطرتِ اندیشه‌ام

خُرد در سینا مگیر اے ہوشمند

دِل بذوقِ خرد مینا بند

در بیانِ اینکہ اصلِ نظامِ عالم از خودی است و تسلسلِ حیاتِ تعیّناتِ وجود بر استحکامِ خودی انحصار دارد

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

خویشتن را چون خودی پیدا کرد — آشکارا عالمِ پندار کرد

ضدّ جان پوشیده اندر ذاتِ او — غیر او پیداست از اثباتِ او

در جهان تخمِ خصومت کاشت است — خویشتن را غیرِ خود پنداشت است

سازد از خود پیکرِ اغیار را — تا فزاید لذّتِ پیکار را

می کشد از قوّتِ بازوی خویش — تا شود آگاه از نیروی خویش

خود فریبی ہا او عینِ حیات — ہمچو گل از خون و ضو عینِ حیات

بهرِ یک گل خونِ صد گلشن کند
از پئے یک نغمه صد شیون کند

یک فلک را صد هلال آورده است
بهرِ حرفے صد مقال آورده است

عذرِ این اسراف و این نگذیں دلی
خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی

حسنِ شیریں عذرِ در دِ کوہکن
نافهٔ عذرِ صد آہوئے ختن

سوزِ پیہم قسمتِ پروانہا
شمعِ عذرِ محنتِ پروانہا

خامہ او نقشِ صد امروز بست
تا بیارد صبحِ فردائے بدست

شعله‌ها ای او صد ابراهیم سوخت
تا چراغِ یک محمدؐ برفروخت

می‌شود از بهرِ اغراضِ عمل
عامل و معمول و اسباب و علل

وسعتِ ایام جولانگاهِ او
آسمان موجی ز گردِ راهِ او

گل بجیبِ آفاق از گلکاریش
شب ز خوابش روز از بیداریش

شعله خود در شرر تقسیم کرد
جزو هستی عقل را تعلیم کرد

خود شکن گردید و اجزا آفرید
اندکی آشفت و صحرا آفرید

بازار از آشفتگی بیزار شد
وز بهم پیوستگی کهسار شد

وانمون خویش را خوئے خودی
خفته در هر ذرّه نیروئے خودی

ناله شد در سینهٔ بلبل طپید
در حریم غنچه خاموشی گزید

قوّتِ خاموش و بیتابِ عمل
از عمل پابندِ اسبابِ عمل

خیز و انگیز و فقد تابد دمد
سود افروزد خرامد پرزند

چون حیات عالم از زور خودی است
پس بقدر استواری زندگی است

قطره چون حرف خودی بر لب کند
هستی بی مایه را گوهر کند

باده از ضعف خودی پیکر است
پیکرش منت پذیر ساغر است

گرچه پیکر می پذیرد جام می
جنبش از ما وام گیرد جام می

کوه چون از خود رود صحرا شود
شکوه سنج یورش دریا شود

موج تا موج است در آغوش بحر
می کند خود را سوار دوش بحر

حلقه زد نور تا گرد دیده چشم
از تلاش جلوه ها جنبید چشم

سبز و چون تاب نمو از خویش یافت
همت او سینه گلشن شگافت

شمع هم خود را بخود زنجیر کرد
خویش را از ذره ها تعمیر کرد

خودگدازی پیشه کرد از خود رمید
هم چو اشک آخر ز چشم خود چکید

گر بفطرت پخته تر بودیم نکین
از جراحت ها بیاسودیم نکین

می شود سرمایه دار از نام غیر
دوش او مجروح بار از نام غیر

چوں زمیں بر ہستیِ خود محکم است
ماہ پابندِ طوافِ پیہم است

ہستیِ مہر از زمیں محکم تر است
پس زمیں مسحورِ چشمِ خاور است

جنبشِ از مرگان دشتِ چنار
مایہ دار از سطوتِ او کوہسار

تار و پودِ کسوتِ او آتش است
اصلِ او یک دانۂ گرد نکش است

زندگی محکم ز الیافِ خودی است
کاہ دار از خوابِ خودی نیروئے زیست

در بیانِ اینکه حیاتِ خودی از تخلیق و تولیدِ مقاصد است

زندگانی را بقا از مدعاست
کاروانش را درا از مدعاست

زندگی در جستجو پوشیده است
اصل او در آرزو پوشیده است

از تمنّا رقصِ دل در سینه‌ها
در سینه‌ها از تاب و آینه‌ها

طاقتِ پرواز بخشد خاک را
خضر باشد موسیِ ادراک را

دل ز سوز آرزو گیرد حیات
غیر حق میرد چو او گیرد حیات

چون ز تخلیقِ تمنّا باز ماند
شهپرش بشکست و از پرواز ماند

آرزو هنگامه آرائے خودی
موج بیتابے ز دریائے خودی

آرزو صیدِ مقاصد را کمند
دفترِ افعال را شیرازه بند

زنده را نفیِ تمنّا مرده کرد
شعله را انقصانِ سوز افسرده کرد

هیئتِ اصلِ دیده بیدارِ ما
بست صورت لذّتِ دیدارِ ما

کبک پا از شوخیِ رفتار یافت
بلبل از سعیِ نوا منقار یافت

نے گرفت از نیستاں آئینِ خویش
نغمہ زد از لذتِ تعیینِ خویش

عقلِ ندرت کوش و گردوں تاز چیست
ہیچ می دانی کہ ایں اعجاز چیست

زندگی سرمایہ دار از آرزوست
عقل از زائیدگانِ بطنِ اوست

چیست نظمِ قوم و آئین و رسوم
چیست راز اختراعاتِ علوم

آرزوئے کو بزورِ خود شکست
سر ز دل بیروں زد و صورت بہ بست

بینی و دست و دماغ و چشم و گوش
فکر و تخییل و شعور و ہوش

زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت
بہرِ حفظِ خویش این آلات ساخت

آگہی از علم و فن مقصود نیست
غنچہ و گل از چمن مقصود نیست

علم از ساماںِ حفظِ زندگی است
علم از اسبابِ تقویمِ خودی است

علم و فن از پرتوِ خیزانِ حیات
علم و فن از خانہ زادانِ حیات

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز
از شرابِ مقصدے مستانہ خیز

مقصدے مثلِ سحر تابندۂ ماسوئی را آتشِ سوزندۂ

مقصدے از آسمانِ بالاتر دلربائے دلستانے دلبرے

باطلِ دیرینہ را غارتگرے فتنۂ در جیبِ سرا پا محشرے

ما زِ تسخیرِ مقاصد زندہ ایم از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست

آرزو را در دلِ خود زندہ دار تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

در بیان اینکه خودی از عشق و محبت استحکام می پزیرد

نقطهٔ نوری که نامِ او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

از محبت می شود پاینده تر
زنده تر سوزنده تر تابنده تر

از محبت اشتعالِ جوهرش
ارتقائے ممکناتِ مضمرش

فطرت او آتش اندوزد ز عشق
عالم افروزی بیاموزد ز عشق

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصل عشق از آب و از خاک نیست

در جهان هم صلح و هم پیکار عشق
آب حیوان تیغ جوهردار عشق

از نگاه عشق خار اشتر شود
عشق حق آخر سراپا حر شود

عاشقی آموز و محبوب طلب
چشم نوح و قلب ایوب طلب

کیمیا پیدا کن از همت کلے
بوسه زن بر آستان کاملے

شمع خود را همچو رومی برفروز
رُومم را در آتشِ تبریز سوز

هست معشوقی نهان اندر دلت
چشم اگر داری بیا بنمایمت

عاشقانِ او ز خوبان خوب تر
از حسینانِ جهان محبوب تر

دل ز عشقِ او توانا می شود
خاک همدوش ثریا می شود

خاکِ نجد از فیضِ او چالاک شد
آمد اندر وجد و بر افلاک شد

دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

طُورِ موجے از غبارِ خانه‌اش
کمتر از آنے ز اوقاتش ابد

پور یا ممنونِ خوابِ رحمتش
در شبستانِ حرم خلوت گزید

ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم
وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز

کعبه ایبت الحرم کاشانه اش
کاسبِ افسنه یاش از دانه اش

تاجِ کسرے زیرِ پائے امتش
قوم و آئین و حکومت آفرید

تا به تختِ خسروی خوابید قوم
دیدهٔ او اشکبار اندر نماز

در دعائے نصرتِ آمیں تیغِ او
قاطعِ نسلِ سلاطیں تیغِ او

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد
مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد
ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

در مصافے پیشِ آں گردوں سریر
دخترِ سردارِ طے آمد اسیر

پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود
آں گردن از شرم و حیا خم کردہ بود

چوں نبی دختر چہ را بے پردہ دید
چادرِ خود پیشِ روئے او کشید

ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم
پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم

روزِ محشر اعتبارِ ماست او
در جہاں ہم پردہ دارِ ماست و

لطف و قہرِ او سراپا رحمتے
آں بیاراں ایں ہا عدا رحمتے

آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد
مکہ را پیغامِ لاتثریب داد

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم
چوں نگہ نورِ دو چشیم و یکیم

از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنمِ یک صبح خندانیم ما

مستِ چشمِ ساقیِ بطحاییم
در جهان مثلِ می و مینائیم

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتشِ او این خس و خاشاک سوخت

چون گلِ صد برگ ما را بوئیست
او ست جانِ این نظام و اینِ و اوست

سرِّ مکنونِ دلِ او مائیم
نعرهٔ بے باکانه زد افشائیم

شورِ عشقش در نی و خامِ من است
می تپد صد نغمه در آغوشِ من

من چه گویم از تو لایش کیست — خشک چوبے در فراقِ او گریست

ہستی مسلم تجلّی گاہِ او — طور ہا بالد ز گردِ راہِ او

پیکرم را آفرید آئینہ اش — صبح من از آفتابِ سینہ اش

در تپیدنِ متصل آرامِ من — گرم تر از صبح محشر شامِ من

ابر آذار است و من بستانِ او — تاکِ من نمناک از بارانِ او

چشم در کشتِ محبت کاشتم — از تماشا حاصلے برداشتم

خاکِ شیراز از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

کشتہ اندازِ مُلّا جامیم
نظم و نثرِ او علاجِ خامیم

شعر لب ریزِ معانی گفتہ است
در ثنائے خواجہ گوہر سفتہ است

"نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان خواجہ اوست"

کیفیت ہا خیز از صہبائے عشق
ہست ہم تقلید از اسمائے عشق

کاملِ بسطامؒ را تقلید فرد
اجتناب از خوردنِ "خر" نوزه کرد

عاشقی محکم شو از تقلید یار
تا کمندِ تو شود زیں شاخسار

اندکے اندر حرائے دل نشیں
ترکِ خو کن سوئے حق ہجرت گزیں

محکم از حق شو سوئے خود گام زن
لات و عزائے ہوس را سر شکن

لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق
جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق

تا خدائے کعبہ نوازد ترا
شرحِ انی جاعل سازد ترا

در بیانِ اینکه خودی از سُوال ضعیف می گردد

اَے فراہم کردہ از شیرانِ خراج
گشتہ روبہ مزاج از اِحتیاج

جُملہ اقسامِ تو از ناداری است
اصلِ علّت ہا ہمین بیماری است

می رُباید فعلیت از فکرِ بلند
می کشد شمعِ خیالِ ارجمند

از خُمِ ہستی می گُلفام گیر!
نقدِ خود از کیسۂ ایّام گیر!

خود فرود آ از شتر مثل عمر — الحذر از منت غیر الحذر

تا بکے در یوزۂ منصب کنی — صورتِ طفلان زنے مرکب کنی

فطرتے کو بر فلک بندد نظر — پست میگردد ز احسانِ دگر

از سوال افلاس گردد خوارتر — از گدائی گدیہ گر نادارتر

از سوال آشفتہ اجزائے خودی — بے تجلی نخل سینائے خودی

مشتِ خاکِ خویش را از هم مپاش — مثلِ مہ رزقِ خود از پہلو تراش

گرچه ماہی تنگ روزی تنگ بخت
در رہِ سیلِ بلا افگندہ رخت

رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو
موجِ آب از چشمۂ خاور مجو

تا نباشی پیشِ پیغمبر خجل
روزِ فردائے کہ باشد جاں گسل

ماہ را روزی رساند از خوانِ مہر
داغ بر دل دارد از احسانِ مہر

ہمّت از حق خواہ و باگردوں ستیز
آبروئے ملّتِ بیضا مریز

آنکہ خاشاکِ تناں از کعبہ رفت
مردِ کاسب را حبیب اللہ گفت

وائے بر منّت پذیرِ خوانِ غیر
گردنش خم گشتهٔ احسانِ غیر

خویش را از برقِ لطفِ غیر سوخت
با پشیزے مایهٔ غیرت فروخت

اے خنک آں تشنه کاندر آفتاب
می نخواهد از خضر یک جامِ آب

ترجمیں از حجلتِ سائل نشد
شکلِ آدم ماند و مشتِ گل نشد

زیرِ گردوں آں جوانِ ارجمند
می رود مثلِ صنوبر بر بلند

در تہی دستی شود خود دار تر
بختِ او خوابید و او بیدار تر

قلزم زنبیل سیلِ آتش است
اگر زدستِ خود رسد نیم خوش است

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

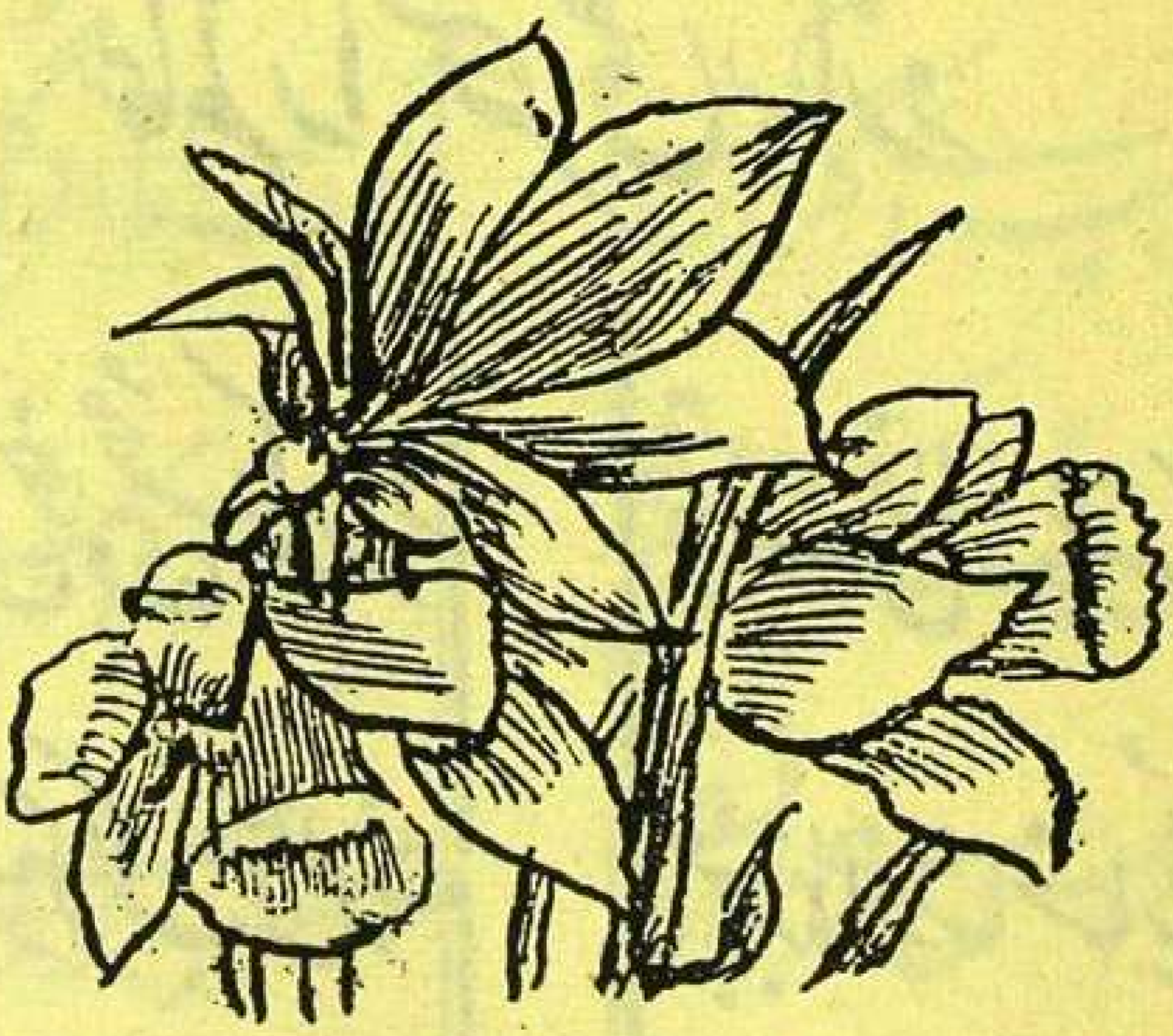

در بیابانیکه چون خودی از عشق و محبّت
محکم می گردد قوائے ظاہرہ و مخفیۂ نظام
عالم را مسخر می سازد

از محبت چوں خودی محکم شود
آفرینش فرمانده عالم شود

پیرِ گردوں کز کواکب نقشہا بست
غنچہ ہا از شاخسارش دوشکست

پنجهٔ او پنجهٔ حق می شود
ماه از انگشتِ او شق می شود

در خصومت با تو جان گردد حکم
تابعِ فرمانِ او دارا و جم

با تو می گویم حدیثِ بوعلی
در سوادِ هند نامِ او جلی

آن نوا پیرائے گلزارِ کهن
گفت با ما از گلِ رعنا سخن

خطّهٔ این جنّت آتش نژاد
از هوائے دامنش مینو سواد

کوچک ابدالش سوئے بازار رفت
از شرابِ بوعلی سرشار رفت

عاملِ آن شهر می‌آمد سوار — همرکابِ او غلام و چوبدار

پیشرو زد بانگ بر اهلِ هوش‌مند — بر جلودارانِ عامل ره بلند

رفت آن درویش سر افگنده پیش — غرق اندر فکرِ خویش

چوبدار از جامِ استکبار مست — بر سرِ درویشِ خود خوشکست

از رهِ عامل فقیر آزرده رفت — دلگران و ناخوش و افسرده رفت

در حضورِ بوعلی فریاد کرد — اشک از زندانِ چشم آزاد کرد

صورتِ برقی که بر کهسار رخت — شیخِ نسلِ آتش از گفتار رخت

از رگِ جانِ آتشِ دیگر کشود — با دبیرِ خویش ارشادے نمود

خامه را بگریز و فرمانے نویس! — از فقیرے سوئے سلطانے نویس!

بندهٔ ام عاملت برسزده است — بر متاعِ جانِ خود رشکے زده است

بازگیر ایں عاملِ بدگوهرے — ورنه بخشم ملکِ تو با دیگرے

نامهٔ آں صوفیِ حق دستگاه — لرزه ها انداخت در اندامِ شاه

پیکرش سرمایهٔ آلام گشت
زرد مثل آفتاب شام گشت

بهرِ عادل حلقه زنجیر جست
از قلندر عفو این تقصیر جست

خسرو شیریں زبان رنگین بیان
نغمه هایش از ضمیر کن فکان

فطرتش روشن ضمیر و مثل ماه
گشت از بهرِ سفارت انتخاب

چنگ را پیشِ قلندر چون نواخت
از نوائے شیشهٔ جانش گداخت

شوکتِ کوشیخته چون کهسار بود
قیمتِ یک نغمه گفتار بود

نیشتر بر قلبِ درویشان مزن
خویش را در آتشِ سوزان مزن

حکایت درین معنی که مسئلهٔ نفی خودی از مخترعاتِ اقوامِ مغلوبهٔ بنی نوع انسان است که بایں طریق مخفی اخلاق اقوام غالبه را ضعیف می سازند

آں شنیدستی که در عهدِ قدیم
گوسفندان در علفزارے مقیم

از وفورِ کاه نسل افزایند
فارغ از اندیشهٔ اعدایند

آخر از ناسازیِ تقدیر میش
گشت از تیرِ بلایِ سینه ریش

شیرها از بیشه سر بر زدند
بر حصارِ گوسفندان تاختند

جذب و استیلا شعارِ قوت است
فتح را راز آشکارِ قوت است

شیرِ نر کوسِ شهنشاهی نواخت
میش را از حریت محروم ساخت

بسکه از شیران نمایید خیر شکار
سرخ شد از خونِ میشان آبِ مرغزار

گوسفندے زیرکے فہمیدۂ
کہنہ سالے گرگ باراں دیدۂ

تنگدل از روزگارِ قومِ خویش
از ستمہائے ہزاراں سینہ ریش

شکوہ ہا از گردشِ تقدیر کرد
کارِ خود را محکم از تدبیر کرد

بہرِ حفظِ خویش مرد ناتواں
حیلہ ہا جوید ز عقلِ کارداں

در غلامی از پئے دفعِ ضرر
قوتِ تدبیر گردد تیز تر

پختہ چوں گردد جنونِ انتقام
فتنہ اندیشی کند عقلِ غلام

گفت با خود عقدهٔ مشکل است
قلزم عمها مرا بی ساحل است

میش نتواند بزور از شیر زیست
سیم ساعد ما و پولاد دست

نیست ممکن کز کمال وعظ و پند
رنگ سبعیت پذیرد گوسفند

شیر نر را میش کردن ممکن است
غافل از خویش کردن ممکن است

مهبط آوازهٔ الهام گشت
واعظ شیران خون آشام گشت

نعره زد اے قوم کذاب اشتر
بے خبر از یوم نحس و مستمر

مایه دار از قوتِ رنج و عنا هستیم
بهرِ شیران مثلِ نخجیر دامیم

دیده بے نور را نور آمدم
صاحبِ دستور و مامور آمدم

توبه از اعمالِ نامحمود کن
آبِ زیانداندیش فکرِ سود کن

هر که باشد مند و زور آور شقی است
زندگی مستحکم از نفیِ خودی است

روحِ نیکان از علف یابد غذا
تارکِ اللحم است مقبولِ خدا

تیزیِ دندانِ تو را رسوا کند
دیده ادراک را اعمی کند

جنّت از بهرِ ضعیفان و زبون است و بس
قوّت از اسبابِ خُسرانِ اُمَوِیّن است

جستجوی عظمت و سطوت و شوکت مکن
تنگدستی از اسارت خوشتر است

برقِ سوزان در کمینِ دانه نیست
دانه گر خرمن شود فرزانه نیست

ذرّه شو صحرا مشو گر عاقلی
تا ز فیضِ نیّرِ تابان شوی

اَی که می نازی بنیرنگ گوسفند
ذبح کن خود را که باشی ارجمند

زندگی را می کند ناپایدار
جبر و قهر و انتقام و اقتدار

سبزه پامال است و رویید بارها
خوابِ مرگ از دیده شوید بارها

غافل از خود شو اگر فرزانه
گر ز خود غافل نه‌ای دیوانه

"چشم بند و گوش بند و لب ببند"
تا نرسد فکرِ تو بر چرخِ بلند

این علف زارِ جهان هیچ است هیچ
تو بریں موهوم مے نازاں مپیچ

قومِ شیراز از نسیمِ هیچ خورد
دل بذوقِ استراحت بسته بود

آمدش این وعظِ خوب آخر پسند
گشت مسحور از کلامِ گوسفند

آنکه کردے گوسفنداں را شکار
کرد دینِ گوسفندی اختیار

با پلنگاں سازگار آمد علف
گشت آخر گوہرِ شیری خزف

از علف آں تیزی دنداں نماند
ہیبتِ چشمِ شرارافشاں نماند

دل بتدریج از میانِ سینہ رفت
جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت

آں جنوں کوشش کامل نماند
آں تقاضائے عمل در دل نماند

اقتدار و عزم و استقلال رفت
اعتبار و عزّت و اقبال رفت

پنجهٔ آہنیں بے زور شد
مُردہ شد دلہا و تنہا گور شد

زورِ تن کاہید و خوفِ جان فزود
خوفِ جاں سرمایۂ ہمّت رُبود

صد مرض پیدا شد از بے ہمّتی
کوتہ دستی بیدلی دُوں فطرتی

شیر بیدار از فسونِ میش خفت
انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

دربیانِ اینکه افلاطونِ یونانی و حافظ شیرازی

که تصوّف و ادبیات اقوام اسلامیه از تخیّلات
ایشان اثر عظیم پذیرفته بر مسلکِ گوسفندی رفته
اند و از ایشان احتراز واجب است

راهبِ اوّل فلاطونِ حکیم
از گروهِ گوسفندانِ قدیم

رخشِ او در ظلمتِ معقول گم
در کهستانِ وجود افگنده سُم

آنچنان افسون نامحسوس خورد
اعتبار از دست و چشم و گوش برد

گفت سِرِّ زندگی در مُردن است
شمع را صد جلوه از افسردن است

بر تخیلهای ما فرمان رواست
جامِ او خواب آور و بیتابی زاست

گوسفندے در لباسِ آدم است
حُکمِ او بر جانِ صوفی محکم است

عقلِ خود را بر سرِ گردون رساند
عالمِ اسباب را افسانه خواند

کارِ اوّل و تحلیلِ اجزائے حیات

فکرِ افلاطون زیاں را سود گفت
حکمتِ او بود را نابود گفت

فطرتش خوابید و خوابے آفرید
چشمِ ہوشِ او سرابے آفرید

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود
جانِ او وارفتہ معدوم بود

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت
خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

زندۂ جاں از عالمِ امکان خوش است
مردۂ دل از عالمِ اعیان خوش است

قطعِ شاخِ سرو رعنائے حیات

حکمتِ او بود را نابود گفت
چشمِ ہوشِ او سرابے آفرید

جانِ او وارفتہ معدوم بود
خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

مردۂ دل از عالمِ اعیان خوش است

آہوش بے بہرہ از لطفِ خرام
لذتِ رفتار بر کبکش حرام

شبنمش از طاقتِ رم بے نصیب
طائرش را سینہ از دم بے نصیب

ذوقِ دیدن ندارد دانہ اش
از طپیدن بیخبر پروانہ اش

راہبِ ما چارہ غیر از رم نداشت
طاقتِ غوغائے ایں عالم نداشت

دل بسوزِ شعلہ افسردہ ایست
نقشِ آں دنیائے افسوں خوردہ ایست

از نشیمن سوئے گردوں پر کشود
باز سوئے آشیاں ناید فرود

در خمِ گردون خیالِ او گم است
من ندانم دُرد یا خشتِ خم است

قومها از سُکرِ او مسموم گشت
خُفت و از لُطفِ عمل محروم گشت

هوشیار از حافظِ صهبا گسار
جامش از زهرِ اجل سرمایه دار

رهنِ ساقی خرقهٔ پرهیزِ او
مَی علاجِ هولِ رستاخیزِ او

نیست غیر از بادہ در بازارِ او
از دو جامَ آشفته شد دستارِ او

چوں خراب از بادۂ گلگوں شود
مایہ دارِ حشمتِ قارون شود

مُفتیِ اعظم اگر مینا بدوش
محتسب ممنونِ پیرِ فروش

طوفِ ساغر کرد مثلِ رنگِ مے
خواست فتوے از رباب و چنگ نے

در مُوزۂ عیش و مستی کاملے
از خُمے خُوں در دلے یا در گلے

رفت و شُغلِ ساغر و ساقی گذاشت
بزمِ رندان و مے باقی گذاشت

چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید
عیش ہم در منزلِ جاناں ندید

در محبّت پیرِ فرهاد بود
برلبِ او شعلهٔ فریاد بود

تخمِ نخلِ آه در کهسار کاشت
طاقتِ پیکار با خسر و نداشت

مُسلم و ایمانِ او زُنّار دار
رخنه اندر دینش از مژگانِ یار

آنچنان مستِ شرابِ بندگی است
خواجه و محرومِ ذوقِ آگهی است

"دعوی او نیست غیر از قال و قیل"
"دستِ او کوتاه و خُرما بر نخیل"

آن فقیهِ ملّتِ می خوارگان
آن امامِ اُمّتِ بیچارگان

گوسفندیست و نوآموختست
عشوه و ناز و ادا آموختست

در ربائیهای او زهریست و بس
چشمِ او غارتگرِ شهریست و بس

ضعف را نامِ توانائی دهد
سازِ او اقوام را غوا کند

از بزیوناں زمیں زیر کتراست
پردهٔ عودش حجابِ اکبراست

نغمه چنگش دلیلِ انحطاط
هاتفِ او جبرئیلِ انحطاط

بگذر از جامش که در میناے خویش
چون مریدان حسن دارد در پیش[1]

[1] فرقه باطنیه ۱۲

از تخیل جنّتی پیدا کند
مرتزا بر نیستی شیدا کند

ناوک اندازی که تا از دل برد
ناوکِ او مرگ را شیرین کند

مارِ گلزاری که دارد زهر ناب
صَید را اوّل همی آرد بخواب

عشق با سحرِ نگاهش خودکشی است
کُشتنش مشکل که مارِ خانگی است

حافظِ جادو بیانِ شیرازی است
عُرفیِ آتش زبانِ شیرازی است

این سُوَیدا مُلکِ خود می‌کرد جهان
آن کنار آب رُکن‌آباد ماند

ایں قتیلِ ہمّتِ مردانہ | آں زِ رمزِ زندگی بیگانہ
دستِ ایں گیرد زِ انجم خوشہ | چشمِ آں از اشک دارد توشہ
روزِ محشر رحم اگر گوید بگیر | عُرفیا! فردوس مَحور او حریر
غیرتِ او خندہ بر حور ارند | پُشتِ او پا بر جنّتِ اعلیٰ زند
بادہ زن با عُرفیِ ہنگامہ خیز | زندہ؟ از صُحبتِ حافظ گریز
ایں فسوں خوان زندگی از مار بود | جامِ او شانِ جمی از مار بود

محفلِ اُو درخورِ ابرارِ نیست
ساغرِ او قابلِ احرارِ نیست

بے نیاز از محفل حافظ گذر
الحذر از گوسفندان الحذر

در بیان آنکه تربیتِ خودی را سه مراحل است

مرحلهٔ اوّل را اطاعت و مرحلهٔ دوم را ضبطِ
نفس و مرحلهٔ سوم را نیابتِ الٰهی نامیده اند

مرحلهٔ اوّل اطاعت

خدمت و محنت شعارِ راشتراست

صبر و استقلال کارِ راشتراست

گامِ او در راهِ کم غو غاستے
کاروان را زود قتِ صحراستے

نقشِ پایش پیشِ قسمتِ هر بشر
کم خور و کم خواب و محنت پیشه گیر

راکب و سامان و محمل می برد
پائے کوباں سوئے منزل می رود

خوش از کیفیتِ رفتارِ خویش
در سفر صابر تر از اسوارِ خویش

تو هم از بارِ فرائض سر متاب
برخوری از عنده حسن المآب

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

ناکس از فرمان پذیری کس نشود
آتش ار باشد ز طغیان خس نشود

هر که تسخیر هوا و پرویں کند
خویش را زنجیری آئیں کند

بادرا از زندان گل خوشبو کند
قید پورانافہ آہو کند

می زند اختر سوئے منزل قدم
پیش آئینے سر تسلیم خم

سبزہ بر دیبا نمود روئیدہ است
پائمال از ترک آں گردیدہ است

لالہ ہم سوختن قانون او
رقص پیرا در رگ اُ خون او

قطرہا دریاست از آئینِ وصل
ذرّہ ہا صحراست از آئینِ وصل

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی
تو چرا غافل ز ایں ساماں روی

بازۓ آزاد دستورِ قدیم
زینتِ پاکن ہماں زنجیرِ سیم

شکوہ سنجِ سختیِ آئینِ مشو
از حدودِ زندگی بیروں مرو

مرحلهٔ دوم ضبطِ نفس

نفسِ تو مثلِ شتر خودپرورست
خودپرست و خودسر و خودسراست

مردِ شو آور زمامِ او بکف
تا شوی گوهر اگر باشی خزف

هر که بر خود نیست فرمانش روان
می شود فرمان پذیر از دیگران

طرحِ تعمیرِ تو از گل ریختند
با محبّت خوف را آمیختند

خوفِ دنیا خوفِ عُقبیٰ خوفِ جان
خوفِ آلامِ زمین و آسمان

حُبِّ مال و دولت و حُبِّ وطن
حُبِّ خویش و اقربا و حُبِّ زن

امتزاجِ ما و طین تن پرست
کُشتهٔ فحشا هلاکِ منکرات

تا عصائے لا اِلٰہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

ہر کہ حق باشد چو جان اندر تنش
خم نگردد پیشِ باطل گردنش

خوف را در سینهٔ او راہ نیست
خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

ہر کہ در تسلیم ما آباد شد
فارغ از بندِ زن و اولاد شد

می کند از ماسوی قطعِ نظر
می نهد ساطور بر حلقوم پسر

با یکی مثلِ هجومِ لشکرست
جان بچشمِ او زبا دارزان ترا ست

لَا اِلٰه باشد صَدف گوہر نماز
قلبِ مُسلم را حج اصغر نماز

در کفِ مُسلم مثالِ خنجرست
قاتلِ فحشا و بغی و مُنکرست

روزہ بر جوع و عطش شبخون زند
خیبرِ تن پُوری را واژگند

مومناں را فطرت افروزست حج
ہجرت آموز و وطن سوزست حج

طاعتے سرمایۂ جمعیتے — ربطِ اوراقِ کتابِ ملّتے

حُبِّ دولت را فنا سازد زکوٰۃ — ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

دل ز حبِّ تنفقوا محکم کند — زر فزاید الفتِ زر کم کند

ایں ہمہ اسبابِ استحکامِ تُست — پختہ محکم اگر اسلامِ تُست

اہلِ قوت شو ز وردِ یا قوی

تا سوارِ اشتر خاکی شوی

مرحلهٔ سوم نیابتِ الٰهی

گر شتربانی جهانبانی کنی
زیبِ سر تاجِ سلیمانی کنی

تا جهان باشد جهان آرا شوی
تاجدارِ مُلکِ لایبلی شوی

نائبِ حق در جهان بودن خوش است
بر عناصر حکمران بودن خوش است

نائبِ حق همچو جانِ عالم است
هستیِ او ظلِّ اسمِ اعظم است

از رموز جزو و کل آگه بود
در جهان قائم بامرالله بود

خیمه چون در وسعت عالم زند
این بساط کهنه را برهم زند

فطرتش معمور و می خواهد نمود
عالمے دیگر بیارد در وجود

صد جهان مثل جهان جزو و کل
روید از کشت خیال او چو گل

پخته سازد فطرت هر خام را
از حرم بیرون کند اصنام را

نغمه زا تار دل از مضراب او
بهر حق بیداری او خواب او

شیب را آموزد آهنگ شباب
می دهد هر چیز را رنگ شباب

نوعِ انسان را بشیر و هم نذیر
هم سپاهی هم سپهگر هم امیر

مُدعایَ عَلَّمَ الْاَسْمَاستے
سِرِّ سُبْحَانَ الَّذِی اَسْرَاستے

از عصا دست سفید شش محکم است
قدرتِ کامل العلمش تُوام است

چون عنان گیرد بدست آن شهسوار
تیز تر گردد سمندِ روزگار

خشک سازد هیبتِ او نیل را
می برد از مصر اسرائیل را

از قُمِ او خیزد اندر گورتن
مُرده جانها چون صنوبر در چمن

ذاتِ او توجیهِ ذاتِ عالم است
از جلالِ او نجاتِ عالم است

ذرّه خورشید آشنا از سایه اش
قیمتِ هستی گران از مایه اش

زندگی بخشد ز اعجازِ عمل
می کند تجدید اندازِ عمل

جلوه ها خیزد ز نقشِ پائے او
صد کلیم آوارهٔ سینائے او

زندگی را می کند تفسیرِ نو
می دهد این خواب را تعبیرِ نو

هستیِ مکنونِ او رازِ حیات
نغمهٔ نشنیدهٔ سازِ حیات

طبعِ فطرت عمرِ ما در خون تپید
تا دو بیتِ ذاتِ او موزون شود

مشتِ خاکِ ما سرِ گردون رسید
زینِ غبارانِ شهسوار آید پدید

خفته در خاکسترِ امروزِ ما
شعلهٔ فردائے عالم سوزِ ما

غنچهٔ ما گلستان در دامن است
چشمِ ما از صبحِ فردا روشن است

اے سوارِ اشهبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدهٔ امکاں بیا

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو
در سوادِ دیدہ با آباد شو

شورشِ اقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشت گوش کن

خیز و قانونِ اخوّت ساز دہ
جامِ صہبائے محبّت تازہ دہ

باز در عالم بیار ایام صلح
جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

ریخت از موجِ خزاں برگِ شجر
چوں بہاراں ریاض ما گذر

سجده‌های طفلک و زنان و پیر | از جبین شرمسارِ ما بگیر

از وجودِ تو سرافرازیم ما

پس بآلامِ جهان سازیم ما

در شرحِ اسرارِ اسمائے علی مرتضیٰ رضؓ

مُسلمِ اوّل شہِ مرداں علیؓ | عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ

از ولائے دودمانش زندہ ام
در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام

نرگسم وارفتہ نظّارہ ام
در ریاضِ او چو بُو آوارہ ام

زمزم ار جوشد ز خاکِ من ازوست
مے اگر ریزد ز تاکِ من ازوست

خاکم و از مہرِ او آئینہ ام
می تواں دیدن نوا در سینہ ام

از رُخِ او فالِ پیغمبر گرفت
ملّتِ حق از شکوہش فر گرفت

قوّتِ دینِ مبیں فرمودہ اش
کائنات آئین پذیر از دودہ اش

مُرسلِ حق کرد نامش بُوتراب
حق یداللہ خواند در اُمّ الکتاب

ہر کہ دانائے رُموزِ زندگیست
سرِّ اسمائے علی داند کہ چیست

خاکِ تاریکے کہ نامِ او تن است
عقل از بیدادِ او در شیون است

فکرِ گردُوں رس زمین پیما از و
دیدہ اعمیٰ گوشِ ناشنوا از و

از ہوس تیغِ دو رُو دارد بدست
رہروان را دل ازین رہزن شکست

شیرِ حق این خاک را تسخیر کرد
این گلِ تاریک را اکسیر کرد

مرتضی کز تیغ او حق روشن است — بوتراب از فتح اقلیم من است

در جهاں هر فتح از کرّاری است — آبروئے مرد از خودداری است

هر که در آفاق گردد بوتراب — باز گرداند ز مغرب آفتاب[1]

هر که زین بر مرکب تن تنگ بست — چون نگین بر خاتم دولت نشست

زیر پاش اینجا شکوه خیبر است — دست او آنجا قسیم کوثر است

از خود آگاهی ید اللّهی کند — از ید اللّهی شهنشاهی کند

[1] معجزهٔ رجعت خورشید ؓ

ذاتِ او دروازهٔ شهرِ عُلوم
زیرِ فرمانش حجازِ و چین و رُوم

حکمِ ان با دیده شدن بر خاکِ خویش
تا مَهِ روشن خوری از تاکِ خویش

خاک گشتن مذهبِ پروانگی است
خاک را شو که این مسلمانگی است

سنگ شو اے همچو گل نازک مدن
تا شوی بُنیادِ دیوارِ چمن

از گلِ خود آدمے تعمیر کُن
آدمے را عالمے تعمیر کن

گر بنا سازی نہ دیوار و درے
خشت از خاکِ تو بندد دیگرے

اَے زِ جورِ چرخ ناہنجار تنگ
جامِ تو فریادیِ بیداد و تنگ

نالہ و فریاد و آہ و تم تا کجا
سینہ کوہاے پہیہم تا کجا

در عمل مخفی است مضمونِ حیات
ذوقِ تخلیق است قانونِ حیات

خیز و خلّاقِ جہانِ تازہ شو
شعلہ در پیراہنِ آوازہ شو

با جہانِ نامساعد ساختن
ہست در میداں سپر انداختن

مردِ خودداری کہ باشد پختہ کار
با مزاجِ او بسازد روزگار

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم
همتش را از مهماتِ عظیم

عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چون خلیل از شعله گل چیدن خوش است

ممکنات قوتِ مردانِ کار
گردد از مشکل پسندی آشکار

حربهٔ دون همتان کین است و بس
زندگی را این یک آئین است و بس

ق

زندگانی قوتِ پیداستی
اصلِ او از ذوقِ استیلاستی

عفوِ بیجا سردیِ خونِ حیات
سکته در بیتِ موزونِ حیات

هر که در قعرِ مذلّت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است

ناتوانی زندگی را رہزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است

از مکارم اندرونِ او تہی است
شیرش از بہرِ مآکم فربہی است

ہوشیار اے صاحبِ عقلِ سلیم
در کمینہا می نشیند ایں غنیم

گر خردمندی فریبِ او مخور
مثلِ حربا ہر زماں رنگش دگر

شکلِ او ہا اہلِ نظر شناختند
پردہ ہا بر روئے او انداختند

گاه او را رحم و نرمی پرده دار
گاه می پوشد ردائے انکسار

گاه او مستور در محبوبی است
گاه پنهان در تهِ معذوری است

چهره در شکلِ تن آسانی نمود
دل ز دستِ صاحبِ قوّت ربود

با تو انائی صداقت توأم است
گر خود آگاهی همین جامِ جم است

زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

مدّعی گر صاحبِ قوّت بود
دعویش مستغنی از حجّت بود

باطل از قوّت پذیرد شانِ حق
خویش را حق داند از بطلانِ حق

از کُن و زہر کوثر می شود
خیر را گوید شرِ می شر می شود

اَے ز آدابِ امانت بے خبر!
از دو عالم خویش را بہتر شمر!

از رموزِ زندگی آگاہ شو
ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو

چشم و گوش و لب کُشائے ہوشمند
گر نہ بینی راہِ حق بر من بخند

حکایتِ نوجوانے از مرو کہ پیشِ حضرت سیّد مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ آمدہ از ستمِ اعدا فریاد کرد

سیّد ہجویر مخدومِ امم
مرقدِ او پیر سنجر را حرم

بندہائے کوہسار آساں گسیخت
در زمینِ ہند تخمِ سجدہ ریخت

عہدِ فاروق از جمالش تازہ شد
حق ز حرفِ او بلند آوازہ شد

پاسبانِ عزّتِ اُمّ الکتاب
از نگاہش خانۂ باطل خراب

صُبحِ ما از مہرِ او تابندہ گشت
خاکِ پنجاب از دمِ او زندہ گشت

عاشق و ہم قاصد و طیارِ عشق
از جبینش آشکار اسرارِ عشق

داستانے از کمالش سر کنم
قلزمے در قطرۂ مُضمر کنم

نوجوانے قامتش بالا چو سرو
واردِ لاہور شد از شہرِ مرو

رفت پیشِ سیّدِ والا جناب
تا رُباید ظُلمتش را آفتاب

گفت محصورِ صفِ اعدا استم
در میانِ سنگها مینا استم

با من آموزای شهِ گردون مکان
زندگی کردن میانِ دشمنان

پیرِ دانائی که در دشتِ جدال
بسته پیمانِ محبت با جلال

گفت ای نامحرمِ از رازِ حیات
غافل از انجام و آغازِ حیات

فارغ از اندیشه اغیار شو
قوتِ خوابیده بیدار شو

سنگ چون بر خود گمانِ شیشه کرد
شیشه گردید و شکستن پیشه کرد

ناتوان خود را اگر رهرو شمرد
نقدِ جانِ خویش با رہزن سپرد

تا کجا خود را شماری ما و طین
از گلِ خود شعلهٔ طور آفرین

با عزیزاں سرگران بودن چرا
شکوه سنجِ دشمنان بودن چرا

راست میگویم عدو ہم یارِ تست
ہستئ او رونقِ بازارِ تست

ہر کہ دانائے مقاماتِ خودی است
فضلِ حق داند اگر دشمن قوی است

کشتِ انسان را عدو باشد سحاب
ممکناتش را برانگیزد ز خواب

سنگ ره آنست اگر همت قوی است
سیل را پست و بلند جاده چیست

سنگ ره گردد فسان تیغ عزم
قطع منزل امتحان تیغ عزم

مثل حیوان خوردن آسودن چه سود
گر بخود محکم نه بودن چه سود

خویش را چون از خودی محکم کنی
تو اگر خواهی جهان برهم کنی

گر فنا خواهی ز خود آزاد شو
گر بقا خواهی بخود آباد شو

چیست مردن از خودی غافل شدن
تو چه پنداری فراق جان و تن

در خودی کُن صُورتِ یوسف مقام
از اسیری تا شهنشاهی خرام

از خودی اندیش و مردِ کار شو
مردِ حق شو حاملِ اسرار شو

شرحِ راز از داستانها میکنم
غنچه از زورِ نفس وا میکنم

"خوشتر آن باشد که سرِّ دلبران
گفته آید در حدیثِ دیگران"

حکایت طائرے کہ از تشنگی بیتاب بود

طائرے از تشنگی بیتاب بود
در تنِ او دم بمثالِ موج دود

ریزۂ الماس در گلزار دید
تشنگی نظارۂ آب آفرید

از فریبِ ریزۂ خورشید تاب
مرغِ ناداں سنگ را پنداشت آب

مایۂ اندوزِ نم از گوہر نشد
زد بر و منقار و کامش تر نشد

گفت الماس اے گرفتارِ ہوس!
تیز بر من کردہ منقارِ ہوس

قطرهٔ آبے نیم ساقی نیم
من برائے دیگراں باقی نیم

قصدِ آزارم کنی دیوانه
از حیاتِ خود نمابیگانه

آبِ من منقارِ مرغان بشکند
آدمی را گوهرِ جان بشکند

طائرِ از الماس کامِ دل نیافت
روئے خویش از ریزه بندهٔ تافت

حسرتِ اندر سینه اش آباد گشت
در گلوئے او نوا فریاد گشت

قطرهٔ شبنم سرِ شاخِ گلے
تافت مثلِ اشکِ چشمِ بلبلے

تاب او محوِ سپاسِ آفتاب
لرزه بر تن از هراسِ آفتاب

کوکبِ رم خوئے گردون زادهٔ
یکدم از ذوقِ نمود استادهٔ

صد فریب از غنچه و گل خوردهٔ
بهره از زندگی نابردهٔ

مثلِ اشکِ عاشقِ دلدادهٔ
زیبِ مژگانے چکید آمادهٔ

مرغِ مضطر زیرِ شاخِ گل رسید
در دهانش قطرهٔ شبنم چکید

ایکه می خواهی ز دشمن جان بری
از تو پرسم قطرهٔ یا گوهری؟

چون سرودِ تشنگی طائر گداخت
از حیاتِ دیگرے سرمایہ ساخت

قطرہ سنجد اندام گوہر خو نبود
ریزۂ الماس بود و او نبود

غافل از حفظِ خودی نگدیم مشو
ریزۂ الماس شو شبنم مشو

پختہ فطرت صورتِ کہسار باش
حاملِ صد ابر و دریا بار باش

صورتِ منصور اگر خود بیں شوی
ہمچو حق بالاتر از آئیں شوی

سوز مضمون و فقر منصور سوخت
جلوہ رقصید و متاعِ طور سوخت

رفت از تن روح گردون تاز او
از اجل بیگانه ماند آواز او

نعره‌اش در لب جوگویا ندید
سر بروں از قطرهٔ خونش کشید

خویش را در باز ایجاب خویش
سیم شد از بستن سیماب خویش

نغمه پیدا کن از تار خودی
آشکارا ساز اسرار خودی

حکایتِ الماس و زغال

از حقیقت باز نگشایم دری
با تو می گویم حدیثِ دیگری

گفت با الماسِ در معدن زغال
ای امینِ جلوه ہائے لازوال

ہمدمیم ہست و بودِ ما یکیست
در جہانِ اہلِ وجود ما یکیست

من نگاہی میرم زردِ ناکسی
تو سرِ تاجِ شہنشاہاں رسی

قدرِ من از بدگلی کمتر ز خاک
از جمالِ تو دلِ آئینہ چاک

روشن از تاریکیِ من محشر است
پس کمالِ جوہرِ خاکستر است

پشتِ پا ہر کس مرا بر سر زند
بر متاعِ ہستیم خنجر زند

بر سر و سامانِ من باید گریست
برگ و سازِ ہستیم دانی کہ چیست؟

موجۂ دودے بہم پیوستہ
مایہ دارِ یک شرارِ رستہ

مثلِ انجم روئے تو ہم خوئے تو
جلوہ ہا خیزد ز ہر پہلوئے تو

گاہ نورِ دیدۂ قیصر شوی
گاہ زیبِ دستۂ خنجر شوی

گفت الماس اے رفیقِ نکتہ بیں
تیرہ خاکِ از پختگی گردد نگیں

تا بہ پیرامونِ خود در جنگ شد
پختہ از پیکار مثلِ سنگ شد

پیکرم از پختگی ذوالنور شد
سینہ ام از جلوہ ہا معمور شد

خوار گشتی از وجودِ خاصِ خویش
سوختی از نرمیٔ اندامِ خویش

فارغ از خوف و غم و وسواس باش
پختہ مثلِ سنگ شو الماس باش

می تپد از وی دو عالم مستنیر
ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر

مُشت خاکے کہ اصل سنگ اسود است
کو سرِ از جیبِ حرم بیرون زدہ است

پختگیہا جُستہ و خود آگاہ شد
زینتِ پہلوئے بیت اللہ شد

رتبہ اش از طورِ بالاتر شدہ است
بوسہ گاہِ اسود و احمر شدہ است

در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی ناکسی ناپختگی است

حکایتِ شیخ و برہمن و مکالمۂ گنگا و ہمالہ

در معنی اینکہ تسلسلِ حیاتِ ملّیہ از محکم گرفتنِ روایاتِ مخصوصۂ ملّیہ می باشد

در بنارس ہمدمے محترم
غوطہ خوارِ قلزمِ بود و عدم

بہرہ وافر ز حکمت داشتے
با خداجویاں ارادت داشتے

ذهن او گیرا و مدرت کوش بود
با شرر یار عقل او همدوش بود

آشیانش صورت عنقا بلند
مهر و مه بر شعلهٔ فکرش سپند

عمر تی بینای او در خواست
ساقی حکمت بجامش می نه بست

در ریاض علم و دانش دام چید
چشم داشش طائر معنی ندید

ناخن فکرش نخون آلوده ماند
عقده بود و عدم نگشوده ماند

آو بر لب شاهد حیران او
چهرهٔ غماز دل حیران او

گفت الماس اے رفیقِ نکتہ بیں
تیرہ خاک از پختگی گردد نگیں

تا بہ پیرامونِ خود در جنگ شد
پختہ از پیکار مثلِ سنگ شد

پیکرم از پختگی ذالنّور شد
سینہ ام از جلوہ ہا معمور شد

خوار گشتی از وجودِ خام خویش
سوختی از نرمیٔ اندامِ خویش

فارغ از خوف و غم و وسواس باش
پختہ مثلِ سنگ شو الماس باش

می تواند زود دنیا را ستیز
ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر

مشت خاکی اصل سنگ اسود است — کو سر از جیب حرم بیرون زدست

پختگیها جست و خود آگاه شد — زینت پهلوی بیت الله شد

رتبه اش از طور بالاتر شد است — بوسه گاه اسود و احمر شد است

در صلابت آبروی زندگی است

ناتوانی ناکسی ناپختگی است

حکایتِ شیخ و برہمن و مکالمۂ گنگا و ہمالہ

در معنی اینکہ تسلسلِ حیاتِ ملّیہ از محکم گرفتنِ روایاتِ مخصوصۂ ملّیہ می باشد

در بنارس با ہمندے محترم
غوطہ خوارِ قلزمِ بود و عدم

بہرہ وافر ز حکمت داشتے
با خداجویاں ارادت داشتے

ذهن او گیرا و مدرت کوش بود
با ثریا عقلِ او همدوش بود

آشیانش صورتِ عنقا بلند
مهر و مه بر شعلهٔ فکرش سپند

مدتی مینای او درخون نشست
ساقیِ حکمت بجامش می نریخت

در ریاضِ علم و دانش دام چید
چشمِ دامش طائرِ معنی ندید

ناخنِ فکرش نخون آلوده ماند
عقده بود و عذر نگشوده ماند

آه بر لب شاهدِ حرمانِ او
چهرهٔ غمّازِ دلِ حیرانِ او

رفت روزی نزد شیخ کاملے — آنکه اندر سینه پرورد دلے

گوش بر گفتارِ آن فرزانه داد — بر لبِ خود مُهرِ خاموشی نهاد

گفت شیخ اے طائفِ حرفِ بلند — اندکے عهدِ وفا با خاک بند

تا شدی آوارهٔ صحرا و دشت — فکرِ بے باکِ تو از گردون گذشت

باز میں در ساز اے گردون نورد — در تلاشِ گوهرِ اسمم مگرد

من نگویم از بتان بیزار شو — کافری شائستهٔ زنّار شو

اَے اَمانت دارِ تہذیبِ کہن
پُشتِ پا بر مسلکِ آبا مزن

گر ز جمعیّت حیاتِ ملّت است
کفر ہم سرمایۂ جمعیّت است

تو کہ ہم در کافری کامل نۂ
در خورِ طوفِ حریمِ دل نۂ

ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور
تو ز آذر من ز ابراہیم دور

قیسِ ما سودائی محمل نشد
در جنونِ عاشقی کامل نشد

مرد چوں شمع خودی اندر وجود
از خیالِ آسمان ہا چہ سود

آب زد در دامنِ کهسار چنگ
گفت روزی با همالِ رودِ لنگ

ای ز صبحِ آفرینش تند و تیز
پیکرت از رود و از نارِ گریز

حق ترا با آسمان همراز ساخت
پای محرومم خرامم ناز ساخت

طاقتِ رفتار از پایت ربود
این وقار و رفعت و تمکین چه سود

زندگانی از خرامِ پیهم است
برگ و سازِ هستیِ موج از رم است

گو چو این طعنه ز دریا بشنید
صد شرار از سینهٔ خارا پرید

گفت اے پہنائے تو آئینہ ام
چوں تو صد دریا در و من سینہ ام

ایں خرام من ناز سامانِ فناست
ہر کہ از خود رفت شایانِ فناست

از مقامِ خودنداری آگہی
بر زیانِ خویش نازی ابلہی

اے ز بطنِ چرخ گردان زادہ
از تو بہتر ساحلِ افتادہ

ہستی خود نذرِ قلزم ساختی
پیشِ ہر در نقدِ جاں انداختی

ہمچو گل در گلستانِ خود دار شو
بہرِ نشترِ بوئے گلچیں مرو

زندگی برجائے خود لیکن ازخیابانِ خودی گلچیدن است

تُرنہا بگذشت و من با دردِ گلم تو گماں داری کہ دُور از منزلم

ہستیم بالید و تا گردوں رسید زیرِ دامانم ثُریّا آرمید

ہستی تو بے نشاں دستِ قلزم است ذرّۂ من سجدہ گاہِ انجم است

چشمِ من بینائے اسرارِ فلک آشنا گوشم ز پیوندِ ملک

تا ز سوزِ سعیِ پیہم سوختم لعل و الماس و گہر اندوختم

قطرهٔ خود را بپای خود مریز
وز طلاطم کوش و با قلزم ستیز

آب گوهر خواه و گوهر زنده شو
بهر گوش شاهدے ویزه شو

یا خود افزا شو سبک رفتار شو
ابر برق انداز و دریا بار شو

از تو قلزم سائل طوفان شود
شکوه سنج تنگی دامان شود

کمتر از موجے شمار خویش را
پیش پائے تو گذارد خویش را

در بیان اینکه مقصدِ حیاتِ مُسلم اعلائے کلمة اللہ است و جہاد اگر محرّک او جُوع الارض باشد در مذہبِ اسلام حرام است

قلب را از صبغة اللہ رنگ داد	عشق را ناموس و نام و ننگ داد
طبعِ مُسلم از محبّت قاہر است	مُسلم ار عاشق نباشد کافر است

تابعِ حق دیدنش نادیدنش
خوردنش نوشیدنش خوابیدنش

در رضایش مرضیِ حق گم شود
این سخن کے باورِ مردم شود

خیمه در میدانِ الّا اللہ زد
در جهان شاهد علی الناس آمد است

شاهدِ حاشا نبیند جز بلی
شاهدِ صادق نیاید جز ولی

قالِ را بگذار و با بابِ حال زن
نورِ حق بر ظلمتِ اعمال زن

در قبائے خسروی درویش زی
دیده بیدار و خدا اندیش زی

قُربِ حق از هر عمل مقصود دار
تا ز تو گردد جلالش آشکار

صلح شهر گردد چو مقصود است غیر
گر خُدا باشد غرض جنگ ست خیر

گر نگردد حق ز تیغ ما بلند
جنگ باشد قوم را ارجمند

حضرتِ شیخ میانمیر ولی
هر خفی از نُورِ جان او جلی

بر طریقِ مُصطفی امحکم پیے
نغمهٔ عشق و محبّت را نوے

تربتش ایمان خاکِ شهرِ ما
مشعلِ نُورِ هدایت بهرِ ما

بر درِ او حبهٔ فرسا اسمان — از مریدانش شه هندوستان

شاه تخم حرص در دل کاشته — قصد تسخیر ممالک داشته

از هوس آتش بجان افروخته — تیغ را اهل من مزید آموخته

در دکن هنگامه ها بسیار بود — لشکرش در عرصه پیکار بود

رفت پیش شیخ گردون پایه — تا بگیرد از دعا سرمایه

مسلم از دنیا سوئے حق رم کند — از دعا تدبیر را محکم کند

شیخ از گفتارِ تشه خاموش ماند
بزمِ درویشان سراپا گوش ماند

تا مریدے سکّهٔ سیمیں بدست
لب کشود و مُهرِ خاموشی شکست

گفت این نذرِ حقیر از من پذیر
اے ز حق آوارگان را دستگیر

غوطه ها زد در حوضے مخت تنم
تا گره نزد در همے را دامنم

گفت شیخ این زرِ تو سلطانِ ماست
آنکه در پیرانِ شاهی گداست

حکمرانِ مهرباده و اسپ ماست
شاهِ ما مفلس ترینِ مردم است

دیدهٔ بر خوانِ اجانب دوخت است
آتشِ جوشش جهانی سوخت است

قحط و طاعون تابعِ شمشیرِ او
عالمے ویرانه از تعمیرِ او

خلق در فریاد از نادارئ
از تهیدستی ضعیف آزارئ

سطوتش اہلِ جہاں را دشمن است
نوعِ انسان کاروانِ او رہزن است

از خیالِ خود فریب و فکر خام
می کند تاراج را تسخیرِ نام

عسکرِ شاہی و افواجِ غنیم
ہر دو از شمشیر جوعِ او دو نیم

آتش جان گدا جوع گدا است
جوع سلطان ملک و ملت را فناست

هر که خنجر بهر غیر الله کشید
تیغ او در سینهٔ او آرمید

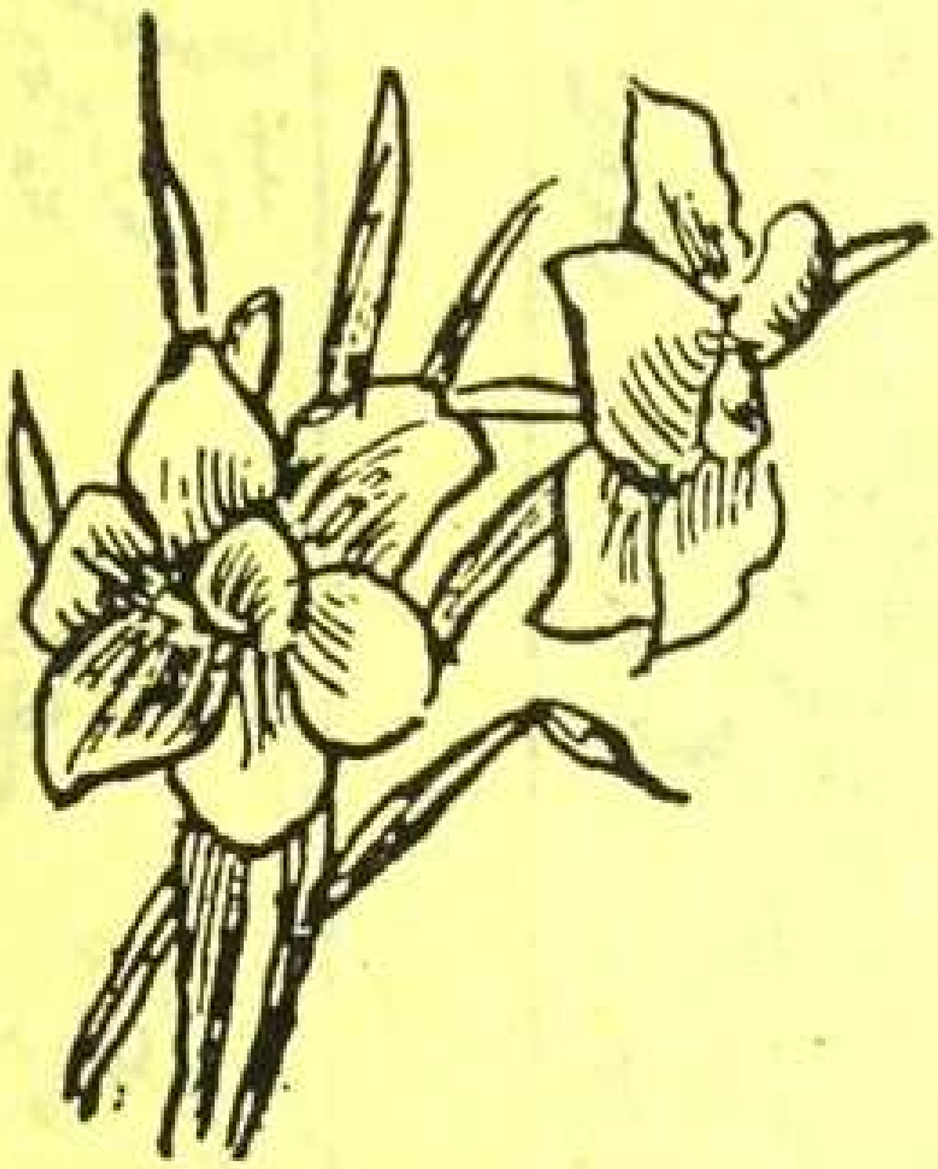

اندرز میرِ نجبات نقشبند المعروف به بابائے صحرائی که برائے مُسلمانان ہندوستان رقم فرموده است

ایکه مثلِ گُل ز گُل مالیدهٔ
تُو ہم از بطنِ خودی زائیدهٔ

از خودی مگذر بقا انجام باش
قطره می باش بحر آشام باش

تو کہ از نورِ خودی تابندہ ای — گر خودی محکم کنی پائندہ ای

سود در جیبِ همیں سودا ستے — خواجگی از حفظِ ایں کالا ستے

ہستی و از نیستی ترسیدہ ای — اے سرت گردم غلط فہمیدہ ای

چوں خبر دارم ز سازِ زندگی — با تو گویم چیست راز زندگی

غوطہ در خود صورتِ گوہر بزن — پس ز خلوتگاہ خود سر بر بزن

زیرِ خاکستر شرارے اندوختن — شعلہ گردیدن نظرہا سوختن

خانهٔ سوزِ طاعتِ چل سالهٔ شو
طوفِ خود کن شعلهٔ حوّالهٔ شو

زندگی از طوفِ دیگر رستن است
خویش را بیتُ الحرم دانستن است

پرّ زن و از جذبِ خاک آزاد باش
همچو طائر ایمن از افتاد باش

تو اگر طائر نه ای اے هوشمند
بر سرِ غار آشیانِ خود مبند

ایکه باشی در پئے کسبِ علوم
با تو می گویم پیامِ پیرِ روم

"علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود"

آگہ از قصۂ آخوندِ روم
آنکہ داد اندر حلب درسِ علوم

پائے در زنجیرِ توجیہاتِ عقل
کشتیش طوفانیِ ظلماتِ عقل

موسیِ بیگانہ سینائے عشق
بیخبر از عشق و از سودائے عشق

از تشکک گفت و از اشراق گفت
وز حکم صد گوہرِ تابندہ سفت

عقدہ ہائے قولِ مشائین کشود
نورِ فکرش ہر خفی را وا نمود

گرد و پیشش بود انبارِ کتب
بر لبِ او شرحِ اسرارِ کتب

پیر تبریزی ز ارشادِ کمال[۱]
جُست راہِ مکتبِ مُلّا جلال

گفت این غوغا و قیل و قال چیست
این قیاس و وہم و استدلال چیست

مولوی فرمود ناداں لب ببند
بر مقالاتِ خردمنداں مخند

پائے خویش از مکتبم بیروں گذار
قیل و قال است این ترا با او چہ کار

قالِ ما از فہمِ تو بالاتر است
شیشۂ ادراک را ارژنگ راست

---

[۱] حضرت شیخ کمال الدین جُندی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲

حرف ملا شمس احدث فزود — آتشے از جانِ تبریزی کشود

بر زمیں برقِ نگاہِ او فتاد — خاک از سوزِ دمِ او شعلہ زاد

التہابِ دل خسِ ادراک سوخت — دفترِ آں فلسفی را پاک سوخت

مولوی بیگانہ از اعجازِ عشق — ناشناسِ نغمہ‌ہائے سازِ عشق

گفت این آتش چسان افروختی — دفترِ ارباب حکمت سوختی

گفت شیخ اے مسلمِ زنّار دار — ذوق و حالِ آں ترا باور چہ کار

حالِ ما از فکرِ تو بالاتر است
شعلۂ ما کیمیائے احمر است

ساختی از برفِ حکمت سازِ رنگ
از سحابِ فکرِ تو بارد تگرگ

آتشے افروز از خاشاکِ خویش
شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش

علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است
معنیِ اسلام ترکِ آب و گل است

چون زِ بندِ آب و گل آزاد نیست
در میانِ شعله‌ها نمکو نشست

علمِ حق را در قفا انداختی
بہرِ نانے نقدِ دیں در باختی

گرمرو در جستجوئے سُرمہ
واقف از چشمِ سیاہِ خود نہ

آبِ حیواں از دہمِ خضر طلب
از دہانِ اژدہا کوثر طلب

سنگِ اسود از درِ بتخانہ خواہ
نافۂ مُشک از سگِ دیوانہ خواہ

سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے
کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے

مُدّتے مخمورِ تاک و بودہ ام
رازدانِ دانشِ نو بودہ ام

باغبانان امتحانم کرده اند
محرمِ این گلستانم کرده اند

گلستانے لالہ زارِ عبرتے
چوں گلِ کاغذ مزاجِ نکہتے

تا زبندِ این گلستان رستہ ام
آشیاں بر شاخِ طوبیٰ بستہ ام

دانشِ حاضر حجابِ اکبر است
بت پرست و بت فروش و بت گر است

پابندانِ مظاہر بستہ
از حدودِ حسن بیرون ناجستہ

در صراطِ زندگی از پا فتاد
بر گلوئے خویشتن خنجر نہاد

آتشے دارد مثالِ لالہ سرد
شعلہ ہائے او مثالِ ژالہ سرد

فطرتش از سوزِ عشق آزاد ماند
در جہانِ جستجو ناشاد ماند

عشق افلاطونِ علت ہائے عقل
بہ شود از نشترش سودائے عقل

جملہ عالم ساجد و مسجودِ عشق
سومنات عقل را محمودِ عشق

ایں مے دیرینہ در میناش نیست
شورِ یارب قسمت شبہاش نیست

قیمتِ شمشادِ خود نشناختی
سروِ دیگر را بلند انداختی

مثلِ نے خود را ز خود کردی تہی
بر نوائے دیگراں دل می نہی

اے گدائے ریزہ از خوانِ غیر
جنسِ خود می جوئی از دکانِ غیر

بزمِ مسلم از چراغِ غیر سوخت
مسجدِ او از شرارِ دیر سوخت

از سوادِ کعبہ چوں آہو رمید
ناوکِ صیّاد پہلویش درید

شد پریشان برگِ گل چوں بوئے خویش
اے ز خود رم کردہ باز آ سوئے خویش

اَے امینِ حکمتِ اُمّ الکتاب
وحدتِ تم گشتہ خود باز یاب

ماکہ دربانِ حصارِ ملتیم
کافرِ ازترکِ شعارِ ملتیم

ساقیا دیرینہ را ساغر شکست
بزمِ رندانِ حجازی بر شکست

کعبہ آباد است از اصنامِ ما
خندہ زن کفر است بر اسلامِ ما

شیخ در عشقِ بتاں اسلام باخت
رشتۂ تسبیح از زنّار ساخت

پیرہا پیرازِ بیاضِ موشدند
سنجرہ بہر کودکانِ کوشدند

دل ز نقشِ لا اِلٰہ بیگانہ — از صنم ہائے ہوس بُت خانہ

میشود ہر سو درائے خرقہ پوش — آہ زیں سوداگرانِ دیں فروش

با مریداں روز و شب اندر سفر — از ضرورت ہائے ملّت بیخبر

دیدہ ہائے بے نورِ مثلِ نرگس اند — سینہ ہا از دولتِ دل مفلس اند

رہنِ مے عمّامہ ہا سجّادہ ہا — پیشِ پائے مے فروشاں اُفتادہ ہا

وعظشان ہم صوفیاں منصب پرست — اعتبارِ ملّتِ بیضا شکست

داغِ ما چشمِ ریحانہ دوخت | مُفتیِ دینِ مبیں فتویٰ فروخت

چیست یاراں بعد ازیں تدبیرِ ما

رُخ سُوئے میخانہ دارد پیرِ ما

الوقتُ سَیفٌ

سبز باد اخاکِ پاکِ شافعی | عالمے سرشار زتاکِ شافعی

فکرِ او کوکبِ زگردوں چیده است
سیفِ بُرّانِ وقت را نامیده است

من چه گویم سرِّ آن شمشیر چیست
آبِ او سرمایه دارِ زندگیست

صاحبش بالاتر از اُمّید و بیم
دستِ او بیضاتر از دستِ کلیم

سنگ از یک ضربتِ او تر شود
بحر از محرومیَ نم بر شود

در کفِ موسیٰ همیں شمشیر بُود
کارِ او بالاتر از تدبیر بُود

سینهٔ دریائے احمر چاک کرد
قُلزمے را خشک مثلِ خاک کرد

پنجهٔ حیدر که خیبر گیر بود
قوتِ او از همیں شمشیر بود

گردشِ گردونِ گردان دیدنی است
انقلابِ روز و شب فهمیدنی است

اے اسیرِ دوش و فردا در نگر
در دلِ خود عالمِ دیگر نگر

در گلِ خود تخمِ ظلمت کاشتی
وقت را مثلِ خطِ پیداشتی

باز با پیمانهٔ لیل و نهار
فکرِ تو پیمودِ طولِ روزگار

ساختی این رشته را از تار و پود
گشتهٔ مثلِ بتانِ باطل فروش

کیمیا بودی دُشتِ گل شدی
سرِّ حق زائیدی و باطل شدی

مُسلمی آزاد این ننگ و نام باش
شمعِ بزمِ ملّتِ احرار باش

تو که از اصلِ زمان آگه نه
از حیاتِ جاودان آگه نه

این و آن پیداست از رفتارِ تو
زندگی سرّیست از اسرارِ تو

اصلِ وقت از گردشِ خم گشتنست
وقتِ جاوید است و خورشید است و بس

عیش و غم عاشق را هم عیدِ اوست
سرِّ تاب و ماه و خورشیدِ اوست

وقت را مثلِ مکان گستردہ
امتیاز روش و فردا کردہ

ای چو بوم کردہ از بستانِ خویش
ساختی از دستِ خود زندانِ خویش

وقتِ ما کو اوّل و آخر ندید
از خیابانِ ضمیرِ ما دمید

زندہ از عرفانِ اصلش زندہ تر
ہستیِ او از سحر تابندہ تر

زندگی از دہر و دہر از زندگی است

لا تسبّوا الدّہر فرمانِ نبی است

یادایامیکہ سیفِ روزگار | با توانا دستی ما بود یار

تخمِ دین در کشتِ دلہا کاشتیم | پردہ از رخسارِ حق برداشتیم

تا خمِ ما عقدۂ دنیا کشاد | بختِ این خاک از سجودِ ما گشاد

از خمِ حق بادۂ گلگون زدیم | بر خیالاتِ کہن شبخون زدیم

اے مے دیرینہ در مینائے تو | شیشہ آب از گرمیٔ صہبائے تو

از غرور و نخوت و کبر و منی | طعنہ بر ناداریٔ ما میزنی

جامِ ما هم زینِ محفل بوده است
سینهٔ ما صاحبِ دل بوده است

عصرِ نو کز جلوه ها آراسته است
از غبارِ پایِ ما برخاسته است

کشتِ حق سیراب گشت از خونِ ما
حق پرستان جهان ممنونِ ما

عالم از ما صاحبِ تکبیر شد
از گلِ ما کعبه ها تعمیر شد

حرفِ اقرأ حق بما تعلیم کرد
رزقِ خویش از دستِ ما تقسیم کرد

گرچه رفت از دستِ ما تاج و نگین
ما گدایان را بچشمِ کم مبین

در نگاهِ تو زیانکاریم ما
کُهنه پنداریم ما خواریم ما

اِعتبار از لا اِلٰه داریم ما
هر دو عالم را نگه داریم ما

از غمِ امروز و فردا رسته ایم
با کسے عهدِ محبّت بسته ایم

در دلِ حق سِرِّ مکنونیم ما
وارثِ موسیٰ و هارونیم ما

مهر و مه روشن ز تابِ ما هنوز
بر قها دارد سحابِ ما هنوز

ذاتِ ما آئینهٔ ذاتِ حق است
هستی مُسلم ز آیاتِ حق است

دُعا

اَے چو جاں اندر وجودِ عالمی
جانِ ما باشی و از ما می رمی

نغمہ از فیضِ تو در عودِ حیات
موت در راہِ تو محسودِ حیات

باز تسکینِ دلِ ناشاد شو
باز اندر سینہ ہا آباد شو

باز از ما خواہ ننگ و نام را
سوختہ تر کن عاشقانِ خام را

از مقدر شکوہ ہا داریم ما
رنگِ تو بالا و نا داریم ما

از تهیدستانِ محرومِ زیاپیوس
عشقِ سلمان و بلال ارزان فروش

چشمِ بیخواب و دلِ بیتاب دہ
بازمارا فطرتِ سیماب دہ

آیتے بہ نماز آیاتِ مبین
تا شود اعناقِ اعدا خاضعین

رشتۂ وحدتِ چو قوم از دست داد
صد گرہ بر روے کارِ ما فتاد

ما پریشان چوں ہجومِ اختریم
ہمدم و بیگانہ از یک دیگریم

بازایں اوراق را شیرازہ کن
بازآئینِ محبت تازہ کن

رہروانِ کہ منزلِ تسلیم بخش
قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش

عشق را از شغلِ آلا اگاہ کن
آشنائے رمزِ الا اللہ کن

منکہ بہرِ دیگراں سوزم چو شمع
بزمِ خود را گریہ آموزم چو شمع

یارب آں اشکے کہ باشد دلفروز
بیقرار و مضطر و آرام سوز

کارمش در باغ و رو دید آتشے
از قبائے لالہ شوید آتشے

دل بدوش و دیده بر فرداستم
در میانِ انجمن تنهاستم

هر کسے از ظنِ خود شد یارِ من
از درونِ من نجست اسرارِ من

در جهان مانند یم من کجاست
در نخل سینایم کلیمِ من کجاست

ظالمم بر خویشتم بیدار کرده ام
شعله را در لعل پیوسته ام

شعلهٔ غارت گرِ سامانِ هوش
آتشے افگنده در دامانِ هوش

عقل را دیوانگی آموخته
علم را سامانِ هستی سوخته

آفتاب از فیض او گردون مقام
برقها محوِ طوافِ او مدام

همچو شبنم دیدهٔ گریان شدم
تا امینِ آتشِ پنهان شدم

شمع را سوزِ عیان آموختم
خود نهان از چشمِ عالم سوختم

شعله‌ها آخر ز هر مویم دمید
از رگِ اندیشه‌ام آتش چکید

عندلیبم از شررها دانه چید
نغمهٔ آتش مزاجی آفرید

سینهٔ عصرِ من از دل خالی است
می‌تپد مجنون که محمل خالی است

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست
آه یک پروانهٔ من اہل نیست

انتظار غمگسارے تا کجا
جستجوے رازدارے تا کجا

اے ز رویت ماه و انجم مستنیر
آتشِ خود را ز جانم بازگیر

ایں امانت بازگیر از سینه ام
خارِ جوہر برکش از آئینه ام

یا مرا یک ہمدمِ دیرینه ده
عشقِ عالم سوز را آئینه ده

موج در بحر است ہم پہلوے موج
ہست با ہمدم تپیدن خوے موج

بر فلک کوکب ندیم کوکبست — ماهِ تابان سرزبانوئے شبست

روز پهلوئے شبِ دلبند ازند — خویش را امروز بر فردا زند

هستی جوئے بجوئے گم شود — موجهٔ بادے بموئے گم شود

هست در هر گوشه ویرانه رقص — میکند دیوانه با دیوانه رقص

گرچه تو در ذات خود یکتاستی — عالمے از بهر خویش آراستی

من مثالِ لالهٔ صحراستم — در هجومِ عالمے تنهاستم

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے
از رموزِ فطرتِ من محرمے

ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ
از خیالِ این و آں بیگانۂ

تا بجانِ او سپارم ہوشِ خویش
باز بینم در دلِ او روئے خویش

سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش
ہم صنم اورا شوم ہم آذرش

تمّت

مثنوی

اسرار خودی

یعنی

حقایق بیت و دیہ

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے بیرسٹر ایٹ لاء لاہور

بفرمائش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری گیٹ لاہور

زر دفعہ بعوض سیر ہمایوں کاہور طبع ہو

دوم تعداد ایکہزار

قیمت بلا جلد عہ

دیباچہ

اس مثنوی کی پہلی ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی
اس دوسری ایڈیشن میں جواب ناظرین کی خدمت میں پیش
کیجاتی ہے بعض بعض جگہ لفظی ترمیم ہے بعض جگہ اشعار
کی ترتیب میں فرق ہے اور ایک آدہ جگہ تشریح مطالب کیلئے
اشعار کا اضافہ ہے لیکن سب سے بڑی ترمیم یہ ہے کہ اس ایڈیشن سے
وہ اشعار خارج کر دیئے گئے ہیں جو خواجہ حافظ پر لکھے گئے تھے۔ اگرچہ
ان سے محض ایک ادبی تعصب البتہ میری تنقید مقصود تھی اور خواجہ حافظ کی شخصیت
سے کوئی سروکار نہ تھا تاہم اس خیال سے کہ یہ طرز بیان اکثر احباب کو ناگوار ہے
میں نے ان اشعار کو نکال کر انکی جگہ نئے اشعار لکھدیئے ہیں جنمیں اس اصول پر
بحث کی ہے جسکے رو سے میرے نزدیک کسی قوم کی لٹریچر کی قدر و
قیمت کا اندازہ کرنا چاہیئے پہلی ایڈیشن کے اردو دیباچے کی اشاعت
بھی ضروری نہیں سمجھی گئی "

محمد اقبال

دی شیخ با چراغ همی گشت گرد شهر

کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زین همرهانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم که یافت می نشود جسته ایم ما
گفت آنکه یافت می نشود آنم آرزوست

مولنا جلال الدین رومی رح

۸۶ء

شکستہ

بخدمتِ

سرسیّد علی امام مدّظلّہ العالی

اے امام! اے سیّدِ والانسب — دُودِ دانت فخرِ اشرافِ عرب

سلطنت را دیدہ افروزِ آمدی — عقلِ کل را حکمت آموزِ آمدی

آشنائے معنیٔ بیگانہ آئ — جلوۂ شمعِ مزار پروانہ آئ

مُرغِ فکرم گلستانہا دیدہ است — از ریاضِ زندگی گل چیدہ است

این گل از تارِ گریبانِ جاں بستہ ام
تازہ تر در دستِ تو گلدستہ ام

ملت از جسم است شاں عرقِ چشم است
جسم را از چشم بینا آبرو است

چشم از نورِ محبت روشنم
اشک از دردِ اعضائے تنم

نذرِ اشکِ سفیر از من پذیر!
گریۂ بے اختیار از من پذیر!

هُو

بسم الله الرحمن الرحیم

تمہید

نیست خشک و تر بیشه من گناهی
چوب هر نخل که منبر نشود دار کنم

نظیری نیشاپوری

راهِ شب جویان مهر عالمتاب ازد
اشکِ من از چشمِ نرگس خواب شست
گریهٔ من مربِ رخ گل آب زد
سبزه از هنگامِ من بیدار رست

باغبان زورِ کلامم آزمود
مصرعے کاربد و شمشیرے دروَد

در چمن خرد دانهٔ شکم نکشت
تارِ نغمم پود و بافغم نرشت

ذرّهٔ ام مهرِ منیرانِ من است
صد سخن اندر گریبانِ من است

خاکِ من روشن تر از جامِ جم است
محرم از نازادهٔ عالم است

فکرم آن آموهٔ سرِ فتراک بست
کوهنوز از نیستی بیرون نجست

سبزه نا روئیده زیبِ گلشنم
گل بشاخ اندر نهال خویشتنم

محفلِ ما را شکر بی هم زدم
زخمه بر تارِ رگِ عالم زدم

بسکه عودِ فطرتم نادر نواست
همنشین از نغمه ام ناآشناست

در جہاں خورشید نو زائید ہ ام
رسم و آئین فلک نادیدہ ام

رم ندیدہ نخجم از تابم ہنوز
ہست تا آتشکدہ سیمابم ہنوز

بحر از رقص ضیایم بے نصیب
کوہ از رنگِ حنایم بے نصیب

خوگرِ من نیست چشمِ ہست و بود
لرزہ بر تن خیزم از خوفِ نمود

بامم از خاور رسید و شب شکست
شبنمِ نو بر گلِ عالم نشست

انتظارِ صبح خیزاں میکشم
اے خوشا زرتشتیانِ آتشم

بے نیاز از گوشِ امروز آمدم
من صدائے شاعرِ فرداستم

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست
یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست

تا امید استم زیاران قدیم
طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

قلزمِ یاراں چو شبنم بے خروش
شبنمِ من مثلِ یم طوفاں بدوش

نغمۂ من از جہانِ دیگر است
ایں جرس کارِ کاروانِ دیگر است

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد

زخمہ باز از بیستی بیتاب کش
چوں گل از خاکِ مزارِ خود بروئید

کاروان ہا گرچہ ہر صبحے گذشت
مثلِ گامِ ما فزوں کم نوگذشت

عاشقم فریاد ایمانِ من است
شورِ حشر از بیخ و بنیانِ من است

نغمہ ام را اندازۂ تار است و بس
من ترنم از شکستِ عود و بس

قطرہ از سیلابِ من رنگینہ بہ
قلزم از آشوبِ او دیوانہ بہ

در نمی گنجد بجو عمانِ من
بحرہا باید پئے طوفانِ من

غنچہ کز بالیدگی گلشن نشد
در خورِ ابر بہارِ من نشد

بر نتابد خواہشِ جانِ من است
کوہ و صحرا بابِ جولانِ من است

پنجہ گر با بحرِ من در آستی
برقِ من در گیر اگر سینا ستی

چشمہ حیواں بر اتم کردہ اند
محرمِ راز حیاتم کردہ اند

ذرہ از سوزِ نوایم زندہ گشت
پرِ کاہ و کرمکِ تابندہ گشت

ہیچکس رازے کہ من گویم نگفت
ہمچو فکرِ من دمِ معنی نسفت

سرِ عیشِ جاوداں خواہی بیا
ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

پیرِ گردوں بامن ایں سر گفت
از ندیماں رازہا نتواں نہفت

ساقیا برخیز و مے در جام کن
محوِ از دلِ کاوشِ ایام کن

شعلۂ آبے کہ اصلش زمزم است
گر گدا باشد پرستارش جم است

می کند اندیشہ را ہشیار تر
دیدۂ بیدار را بیدار تر

اعتبارِ کوہ بخشد کاہ را
قوتِ شیراں دہد روباہ را

خاک را اوجِ ثریا می دہد
قطرہ را پہنائے دریا می دہد

خامشی را شورشِ محشر کند
پایۂ کبک از خونِ ما زرا حمر کند

خیز و در جامم شرابِ ناب ریز
در شبِ اندیشه ام مهتاب ریز

تا سوئے منزل کشم آوارہ را
ذوقِ بیتابی دہم نظارہ را

گرم رو از جستجوئے نوشوم
روشناسِ آرزوئے نوشوم

چشمِ اہلِ ذوق را مرمُوز شوم
چوں صدا در گوشِ عالم گم شوم

قیمتِ خویش سخن بالا کنم
آبِ چشمِ خویش در کالا کنم

باز بر خوانم ز فیضِ سرمدی
دفترِ رفتہ اسرارِ علوم

جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار
من فروغِ یک نفس مثلِ شرار

شمع سوزان ساختم بی پرتو نامم
بادهٔ شبجوش سختم ریختم پیمانه‌ام

پیروی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوه‌ها تعمیر کرد

ذره از خاکِ بیابان رخت بست
تا شعاعِ آفتاب آمد بدست

موجم و در بحرِ او منزل کنم
تا دُرِ تابندهٔ حاصل کنم

من که ستیها ز صهبایش کنم
زندگانی از نفسهایش کنم

شب دلِ من مأمنِ فریاد بود
خامشی از یارم آباد بود

شکوه آشوبِ عجم دود دلم
از تهی‌پیمانگی نالان شدم

ایں قدر منظارہ ام بیتاب شد
بالِ او پرشکست و آخر خواب شد

روئے خود بنمود و پیرِ خویش گشت
گوئے بحرف پہلوی نشتر آں نوشت

گفت اے دیوانۂ اربابِ عشق
جرعہ گیر از شرابِ ناب عشق

پیرِ جگر ہنگامۂ محشر زان
شیشہ بر سر دیدہ بر نشتر زان

خندہ را سرمایۂ صد نالہ ساز
اشکِ خونیں را جگر پر کالہ ساز

تا بکے چوں غنچہ می باشی خموش
نکہتِ خود را چو گل ارزاں فروش

ور گرہ ہنگامہ داری چوں سپند
محملِ خود بر سرِ آتش بند

چوں جرس آصفر ز ہر خارِ بدن
نالۂ خاموشی را بر دل فگن

آتشی در بزم عالم برفروز
دیگران را هم ز سوزِ خود بسوز

فاش گو اسرارِ پیرِ میفروش
موجِ می شو کسوتِ مینا بپوش

سنگ شو آئینهٔ اندیشه را
بر سرِ بازار بشکن شیشه را

از نیستان همچو نے پیغام زن
قدس را از قومِ حے پیغام زن

ناله را اندازِ نوا بیجا مکن
نرم را از های و هو آباد کن

خیز و جانِ نو بده هر زنده را
از قمِ خود زنده تر کن زنده را

خیز و پا بر جادهٔ دیگر بنه
جوشِ سودائے کهن از سر بنه

آشنائے لذتِ گفتار شو
اے درائے کاروانِ ما بیدار شو

زیں سخن آتش بجانم در فتاد — مثلِ نے ہر نغمہ آلستن شدم

چوں نوا از تارِ خود بر خاستم — جذبتے از بہر گوشِ راستم

برگرفتم پردۂ رازِ خودی — دامنودم سرِ اعجازِ خودی

بُود نقشِ ہستیم انگارۂ — ناقبولے ناکسے ناکارۂ

عشق تسویہاں زدہ مرآدم شدم — عالمِ کیف و کمِ عالم شدم

حرکتِ اعصاب گرد و دیدہ ام — در رگِ مہ ورۂ خوں دیدہ ام

بہرِ انسان چشمِ من شب بہا گریست — تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست

از درونِ کارگاهِ ممکنات
برکشیدم سرِّ تقویمِ حیات

من کہ این شب را چو روز آراستم
گردِ پائے ملّتِ بیضا شستم

ملّتے در باغ و راغ آوازه اش
آتشِ دلها سرود تازه اش

ذرّه کشت و آفتاب انبار کرد
خرمنِ از صد رُو و صد عطار کرد

آهِ گرمم رخت بر گردون کشید
گرچه دودم از تبارِ آتش است

خامه ام از همتِ فتّاح و بلند
رازِ این نخ پرده در صحرا فگند

قطره تا هم پایه دریا شود
ذرّه از بالیدگی صحرا شود

شاعری زین مثنوی مقصود نیست — بت پرستی بت گری مقصود نیست

هندیم از پارسی بیگانه ام — ماهِ نو باشم تهی پیمانه ام

حُسن انداز بیان از من مجو — خونساد اصفهان از من مجو

گرچه هندی در عذوبت شکر است[۲] — طرزِ گفتارِ دری شیرین تر است

فکرِ من از جلوه اش مسحور گشت — خامه من شاخِ نخلِ طور گشت

پارسی از رشعتِ اندیشه ام — در خور و با فطرتِ اندیشه ام

[۳]

خُرده بر سینا نگیرای هوشمند — دل بذوقِ خرده سینا بند

[۵] راز دان و همزبان نوازان
چون لالی فکر ما در الفاظ

دیباچہ

دربیان آنکہ اصل نظامِ عالم از خودی است و تسلسلِ حیاتِ تعیناتِ وجود بر احکامِ خودی منحصر دارد

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

خویشتن را چون خودی دید آفرید
آشکارا عالمِ پیدا کرد

جہد لولو شد اندر ذاتِ او
غیرِ او پیدا ست از اثباتِ او

جہد را تخمِ خصومت کاشت است
خویشتن را غیرِ خود پنداشت است

۱؎ اس عنوان کے ذیل میں جو اشعار ہیں اُن سے لفظ خودی کے معنی پر روشنی پڑے گی اس ضمن میں صفحہ نمبر ۲۲ کے اشعار بھی زیرِ نظر رکھئے

سازد از خود پیکرِ اغیار را
تا فزاید لذّتِ پیکار را

میکشد از قوّتِ بازوئے خویش
تا شود آگاه از زیر و زبرِ خویش

خود فریبی ہائے او عینِ حیات
ہمچو گل از خون و خو عینِ حیات

بہرِ یک گل خون صد گلشن کند
از پئے یک نغمه صد شیون کند

یک فلک را صد هلال آورده است
بہرِ حرفے صد مقال آورده است

عذرِ این اسراف و این رنگین دلی
خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی

حسنِ شیرین عذرِ درد کوہکن
نافهٔ عذرِ صد آهوئے ختن

سوزِ پیہم قسمتِ پروانه ہا
شمع عذرِ محنتِ پروانه ہا

خامۂ او نقش صد البست مرور
تا بیارد صبح فردائے بدست

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت
تا چراغِ یک محمدؐ برفروخت

می شود از بہرِ اغراضِ عمل
عامل و معمول و اسباب و علل

خیز و انگیزد فتد تا بدمدمد
سوزد و فرسود و خرامد پرزند

وسعتِ ایام جولانگاہِ او
آسمان موجے ز گردِ راہِ او

گل بجیب آفاق از گلکاریش
شب ز خوابش روز از بیداریش

شعلۂ خود در شرر تقسیم کرد
جز پرستی عقل را تعلیم کرد

خود شکن گردید و جز را آفرید
اندکے آشفت و صحرا آفرید

بازاز آشفتگی بیزار شد
و نه هم پیوستگی کهسار شد

دانمون خویش را خوئے خودی است
خفته در هر ذرہ نیروئے خودی است

قوت خاموش و بیتابِ عمل
از عمل پایندِ اسبابِ عمل

چون چنین عالم ز زورِ خودی است
این قدر استواریِ زندگی است

قطره چون حرفِ خودی بر زد گهر
هستیِ بے مایه را گوهر کند

بادهٔ ضعفِ خودی بے پیکر است
پیکرش منت پذیرِ ساغر است

گرچه پیکر می پذیرد جامِ ما
گردشش از ما و ام گیرد جامِ ما

کوه چون از خود دود صحرا شود
شکوه سنج جوشِ دریا شود

موج تا موج است در آغوشِ بحر
می کند خود را سوارِ دوشِ بحر

حلقهٔ زر تا گرد دیدِ چشم
ارتلاشِ جلوه ها جنبید چشم

سبزه چون تا دامنِ خویش یافت
همتِ او سینهٔ گلشن شگافت

شمع هم خود را نجود در نخبیر کرد
خویش را از ذره ها تعمیر کرد

خود گدازی پیشه کرد از خود رمید
هم چو اشک آخر ز چشمِ خود چکید

گر بفطرت پخته تر بودی نگین
از جراحت ها بیاسودی نگین

می شود سرمایه دارِ نامِ غیر
دوشِ او مجروح دارد بارِ نامِ غیر

چوں زمیں بر ہستیِ خود محکم است
ماہ پایندِ طوافِ ہم است

ہستیِ مہر از زمیں محکم تر است
پس زمیں مسحورِ چشمِ خاور است

جنبش از مژگانِ دہقانِ چنار
مایہ دار از سطوتِ او کوہسار

تار و پودِ کسوتِ او آتش است
اصلِ او یک دانۂ گردنکش است

چوں خودی آرد بہم نیرو بہ زیست
می کشاید قلزمے از جوئے زیست

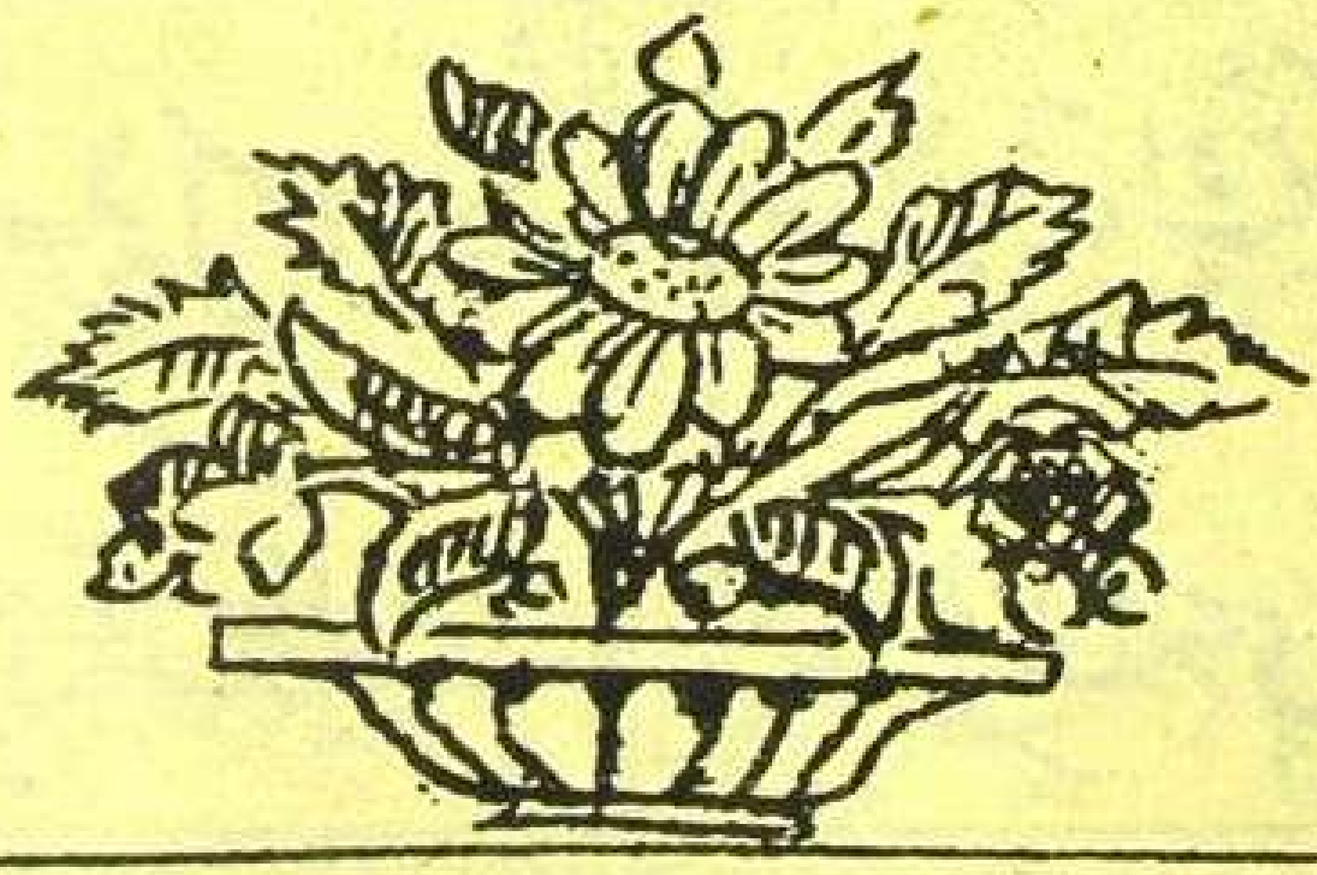

دربیانِ آنکه حیاتِ خودی از تخلیق و تولید مقاصد است

زندگانی را نباشد از مدعا ست — کارِ او اندیشه را ورا از مدعا ست

زندگی در جستجو پوشیده ست — اصلِ او در آرزو پوشیده ست

آرزو را در دلِ خود زنده دار — تا نگردد مشت خاکِ تو مزار

آرزو جانِ جهانِ رنگ و بوست — فطرتِ هر شی امینِ آرزوست

از تمنا رقصِ دل در سینه ها — سینه ها از تابِ او آئینه ها

طاقتِ پرواز بخشد خاک را — خضر باشد موسیِ ادراک را

دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات — غیرِ خونِ حسرت و خواهش مگیر

چون ز تخلیقِ تمنا باز ماند — شهپرِ شوق شکست و از پرواز ماند

آرزو هنگامه آرائے خودی — موج بیتابِ نوائے خودی

آرزو صیدِ مفاصد کمند — دفترِ افعال را شیرازه بند

زنده را فعلی تمنا مرده کرد — شعله را انقصانِ سوزاں افسرده کرد

چیست اصلِ دیده بیدارِ ما؟ — هست صورت لذتِ دیدارِ ما

کبک پا از شوخیِ رفتار یافت — بلبل از سعیِ نوا منقار یافت

نے بدن از نیستاں آباد شد — نغمه از زندانِ نے آزاد شد

عقلِ ندرت کوش و گردون تاز چیست
هیچ میدانی کہ این اعجاز چیست

زندگی سرمایہ دار از آرزوست
عقل از زائیدگانِ بطنِ اوست

چیست نظمِ قوم و آئین و رسوم
چیست رازِ تازگیہائے علوم

آرزوئے کو بزورِ خود شکست
سر زدل بیرون زد و صورت ببست

بینی و دست و دماغ و چشم و گوش
فکر و تخییل و شعور و یاد و ہوش

زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت
بہرِ حفظِ خویش این آلات ساخت

آگہی از علم و فن مقصود نیست
غنچہ و گل از چمن مقصود نیست

علم از سامانِ حفظِ زندگی است
علم از اسبابِ تقویمِ خودی است

علم و فن از پیش خیزانِ حیات
علم و فن از خانه زادانِ حیات

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز
از شرابِ مقصدے مستانہ خیز

مقصدے مثلِ سحر تابندۂ
ماسوی را آتشِ سوزندۂ

مقصدے از آسمان بالاترے
دلربائے دلستانے دلبرے

باطلِ دیرینہ را غارتگرے
فتنہ در جیبِ سراپا محشرے

تا نخیزد تقاضِ صدق و یم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

در بیان اینکه خودی از عشق و محبت استحکام می پزیرد

نقطهٔ نوری که نامِ او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

از محبت می شود پائنده تر
زنده تر سوزنده تر تابنده تر

از محبت اشتعالِ جوهرش
ارتقائے ممکناتِ مضمرش

فطرتِ او آتش اندر آتش است
عالم افروزی و سوزندگی است

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصلِ عشق از آب و گل خاک نیست

در جہاں ہم صلح دہم ہم پیکار عشق
آبِ حیواں تیغِ جوہر دارِ عشق

از نگاہِ عشق خار اشتق شود
عشقِ حق آخر سراپا حق شود

عاشقی آمد ز محبوبے طلب
چشمِ نوحے قلبِ ایوبے طلب

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے

شمعِ خود را همچو ما می بر فروز
روم را در آتشِ تبریز سوز

مست شو تا نہان اندر لمست
چشم اگر داری سیہ تا مئیت

عاشقانِ از خوباں خوب تر
خوشتر و زیباتر و محبوب تر

دل ز عشقِ او تواناں می شود
خاکِ ہمدوشِ ثریا می شود

خاکِ نجد از فیضِ او چالاک شد
آمد اندر وجد و بر افلاک شد

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

طُور موجے از غبارِ خانه اش
کعبه را بیت الحرم کاشانه اش

کمتر از آنے ز اوقاتش ابد
کاسبِ افزایش از ذاتش ابد

نورِ یزدان در دلِ او مشتعل
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے او مثل

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم
تا به تختِ خسروی خوابید قوم

وقتِ هیجا تیغِ او آہن گداز
دیدۂ او اشکبار اندر نماز

دردِ عاشق صورتِ آمیزشِ تیغ اوست
قاطعِ نسلِ سلاطینِ تنعّم خوا

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد
مسندِ اقوامِ پیشیں دور کرد

از کلیدِ دینِ دردِ دنیا کشاد
ہمچو او بطنِ ام گیتی نزاد

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

در مصافِ پیشِ آں گردوں سپہ
دخترِ سردارِ طے آمد اسیر

پائے در زنجیر و هم بے پردہ بود
گردن از شرمِ حیا خم کردہ بود

دخترک را چوں نبی بے پردہ دید
چادرِ خود پیشِ روئے او کشید

ما زناں خاتونِ طے عریاں تریم
پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم

روزِ محشر اعتبارِ ماست او
در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

لطف و قہر او سراپا رحمتے
آں بیاباں ایں باغ رحمتے

آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد
لا تثریب[1] گفتہ را پیغامِ داد

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم
چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم

از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنمِ یک صبحِ خندانیم ما

مستِ چشمِ ساقیِ بطحا ستیم
در جہاں مثلِ مے و مینا ستیم

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت

[1] لا تثریب علیکم الخ یعنے تمہارے لیے کوئی تعزیر نہیں، اگرچہ کفار عرب نبی کریم کو بہت ایذا دیتے تھے۔ مگر فتح مکہ کے بعد جب کہ فاتح کو انتقام کا حق اور قوت حاصل تھی حضور علیہ السلام نے لا تثریب علیکم فرما کر سب کو معاف فرمایا

چوں گلِ صد برگ را بوئیست

اوستادِ جانِ این نظام و اوست

ستر مکنون دلِ او مائیم

نعرہ بے باکانہ زد افشا شدیم

شورِ عشقش در نئے خاشِ من

می تپد نغمہ در آغوشِ من

چیستم گویم از تولّائش کہ چیست

خشک چوبے چو در فراقِ او گریست

ہستی مسلم تجلّی گاہِ او

طور ہا بالد ز گردِ راہِ او

پیکرم را آفرید اندیشہ اش

صبحِ من از آفتابِ سینہ اش

در تپیدم بندہ آرامِ من

کرمتر از صبحِ محشر شامِ من

ابر آذار است بر بستانِ او

تاک من نمناک از بارانِ او

چشم در کشتِ محبت کاشتم
از تماشا حاصلے برداشتم

خاکِ شیراز از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

گفتہ اندازِ مُلّا جامیم
نظم و نثرِ او علاجِ خامیم

شعرِ لب ریزِ معانی گفتہ است
در ثنائے خواجہ گوہر سفتہ است

نُسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان خواجہ اوست

کیفیت ما خیز از صہبائے عشق
ہستیم تقلید از اسمائے عشق

کارِ ما بسطام و تقلید و سرد
اجتناب از خوردنِ خمر بوزہ کرد

عاشقی محکم شو از تقلید پا
تا کمندِ تو شود زیرِ ذا شکار

اندکے اندر حرا دل نشیں
ترکِ خو کن سوئے حق تحریک گزیں

محکم از حق شو سوئے خود گاز من
لات و عزائے ہوس را سر شکن

لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق
جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرحِ انی جاعل سازد ترا

لہ سلطان - غلبۂ قوت -

کہ انی جاعل فی الارض خلیفۃ (آیہ شریفہ)

در بیانِ اینکه خودی از رسوائی ضعیف می گردد

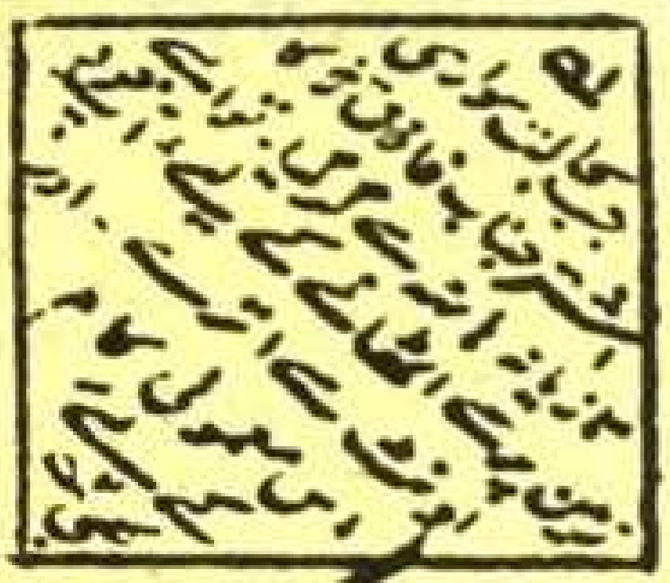

اے فرسیم کرہ از شیراں خراج
گشتہ روبہ مزاج از اِیں احتیاج

خستگیہا تے تواں زنہاری ات
اصل تو دِہ سیں سماری ات

می رباید رفعت از فکرِ بلند
می کُشد شمعِ خیالِ ارجمند

از خمِ ہستی مئے گلفام گیر!
نقدِ خود از کیسہ ات ناکام گیر!

خود فروداں از شرابِ مثلِ عمر
الحذر از منتِ غیر الحذر

تا بکے در یوزہ منصب کنی
صورتِ طفلان نے زمرکب کنی

قطرے کو بر فلک بندد نظر
پست میگردد ز احسانِ دگر

از سوال افلاس گردد خوار تر
از گدائی گدیہ گرنا دار تر

از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلی نخل سینائے خودی

مشتِ خاکِ خویش را از ہم مپاش
مثلِ مہ رزقِ خود از پہلو تراش

گرچہ باشی تنگ روز و تنگ بخت
در رہِ سیلِ بلا افگندہ رخت

رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو
موجِ آب از چشمۂ خاور مجو

تا نباشی پیشِ پیغمبر خجل
رزقِ فردائے کہ باشد جاعل

ماہ را زیبد سماز خوانِ مہر — داغ بر دل دارد از احسانِ مہر

ہمتش از حق خواہ و باگردوں ستیز — آبروئے ملّتِ بیضا مریز

آنکہ خاشاکِ تبا از کعبہ رفت[1] — مردِ کاسب را حبیب اللہ گفت

وائے بر تسخیرِ خوانِ غیر رفت — اردنش خم گشتہ احسانِ غیر

خویش را از برقِ لطفِ غیر سوخت — با پشیزے مایۂ غیرت فروخت

اے خنک آتش کہ ماند آفتاد — می نخواہد از خضر یک جامِ آب

ترجمہ از خجستہ سائل نشد — شکلِ آدم ماند و مشتِ گل نشد

---

[1] الکاسب حبیب اللہ (حدیث)

[2] پشیز - کوڑی

زیر گردون آب جوانِ ارجمند
می رود مثلِ صنوبر سربلند

در تهی دستی شود خود دار تر
سخت و خواهید او و بیدار تر

قلزم از سیلِ آتش است
گر ز دستِ خود رسد بم خوش است

چون حباب از غیرتِ مردانه باش
هم به بحر اندر نگون پیمانه باش

در بیان آنکہ چوں خودی از عشق و محبت محکم میگردد

قوتِ ظاہر و مخفیۂ نظامِ عالم را مسخر می سازد

از محبت چون خودی محکم شود
قوتش فرمانده عالم شود

پیرِ گردون کو اگر نقشِ تست
غنچہ ہا از شاخسارِ او شکست

پنجۂ او پنجۂ حق می شود[1]
ماه را انگشتِ او شق می شود

در خصومت جان چو جان گردد دو چند
تابع فرمانِ او دارا و جم[2]

---

[1] تلمیح ہے معجزۂ شق القمر کی طرف

[2] جم - منصف -

با تو می گویم حدیثِ بوعلی — در سوادِ اصبہان نامِ اوجلی

آں نوا پیرا سکِ گلزارِ کہن — گفت با ما از گلِ رعنا سخن

خطۂ ایں جنتِ آتش نژاد — از ہوا دادِ منش مینو سواد

کوچک ابدالش سوئے بازار رفت — از شرابِ بوعلی سرشار رفت

عاملِ آں شہر می آمد سوار — ہمرکابِ او غلام و چوبدار

پیشتر زد بانگ سے آنہا ہوشمند — بر جلودارانِ عامل رہ مبند

رفت آں درویش سر افگندہ پیش — غوطہ زن اندر یمِ افکارِ خویش

لہ عامل ۔ گورنر ۔ والی

لہ تلمیح ہے حضرت بوعلی قلندر کے اس شعر کی طرف "مرحبا اے بلبلِ باغِ کہن
از گلِ رعنا مگو با ما سخن" ۵۲ کوچک ابدال اصطلاح شعرا میں یدیضا دست کو
کہتے ہیں ۵

چو بدار از جامِ استکبار مست
بر سرِ درویش چوبِ خود شکست

از رهِ عامل فقیر آزرده رفت
دلگران و ناخوش و افسرده رفت

در حضورِ بوعلی فریاد کرد
اشک از رخسار چشمِ آزاد کرد

صورتِ پیرِ که بر کهسار سخت
شیخ سیلِ آتش از گفتار سخت

از رگِ جانش دگر خون کم شود
با دبیرِ خویش ارشاد نمود

خامه را بگیر و فرمانی بنویس!
از فقیر سوی سلطانی بنویس!

بندهٔ ما عاملت بی‌سر زده است
بر متاعِ جانِ خود خنجر زده است

باز گیر این عاملِ بدگوهرے
ورنه بخشم ملکِ تو با دیگرے

نامهٔ آن بندهٔ حق دستگاه

پیکرش سرمایهٔ اکرام گشت
بهر عامل حلقه زنجیر جست
خسرو شیرین زبان شکّر فشان
طرّهٔ تُرکش ز مشک آلوده تاب

چنگ را پیش قلندر چون نواخت
شوکتی گونی چو کوهی بود
نیشتر در قلب درویشان مزن

لرزه‌ها انداخت در اندام شاه

زر مثال آفتاب شام گشت
از قلمرو عفو این القصّه جست
نغمه‌هایش از ضمیر کن فکان
گشت از بهر سفارت انتخاب

از نوائی شیشهٔ حالش گداخت
قیمت یک نغمه گفتار بود
خونش را در آتش سوزان مزن

حکایت درین معنی که مسئلهٔ نفی خودی از مخترعات اقوام مغلوبهٔ بنی نوع انسان است که باین طریق مخفی اخلاق اقوام غالبه را ضعیف می سازند

آن شنیدستی که در عهد قدیم — از گوسفندان در علف زاری مقیم

از وفور کاه نسل افزا بدند — فارغ از اندیشهٔ اعدا بدند

آخر از ناسازی تقدیر میش — گشت از تیر بلائے سینه ریش

---

۱ علف زار - چراگاه -

شیرہا از بیشۂ سر بر زدند
بر حصارِ گوسفندان تاختند

جذب و استیلا شعارِ قوت است
فتح را رازِ آشکارِ قوت است

شیرِ نر کوسِ شہنشاہی نواخت
پیش را از حضرت محروم ساخت

بسکہ از شیراں نیاید خیر و شر
سُرخ شد از خونِ میش آں مرغزار

گوسفندے زیرکے فہمیدۂ
کہنہ سالے گرگ باراں دیدۂ

تنگدل از روزگارِ قومِ خویش
از ستمہائے ہنرورانِ میش

شکوہ ہا از گردشِ تقدیر کرد
کارِ خود را محکم از تدبیر کرد

بہرِ حفظِ خویش مردِ ناتواں
حیلہ ہا جوید ز عقلِ کارداں

در غلامی از پئے دفعِ ضرر — قوتِ تدبیر گردد تیز تر

پختہ چوں گردد جنونِ انتقام — فتنہ اندیشی کند عقلِ غلام

گفت با خود عقدہ ہا مشکل است — قلزمِ غمہا مرا ساحل است

پیشِ تو اند نبرد از شیر دست — پیشِ ساحر عقدہ ہا او پولاد دست

نیست ممکن کز کمال وعظ و پند — شورِ گرگی آفرینندہ گوسفند

شیرِ نر را میش کردن ممکن است — تا فطرتش از خویش کردن ممکن است

صاحبِ آوازۂ الہام گشت — واعظِ شیراں خونِ آشام گشت

نعرہ زد اے قوم کذاب است اشر — او بے خبر از یومِ یحسبن مستمر

مایہ دار از قوتِ روحانیم — بہرِ شیرِ مُنزلِ یزدانیم

دیدہ بے نُور را نُور آمدم — صاحبِ دستور و مامور آمدم

توبہ از اعمالِ نامحمود کُن — اے زیاں اندیش فکرِ سُود کُن

ہر کہ با تندرو آشتی است — زندگی مستحکم از نفی خودی است

رُوح یکساں از علف یا بذغذا — تارک اللحم است مقبولِ خدا

تیز می رندانِ رسوا کُند — دیدۂ ادراک را اعمی کُند

جنت از بہرِ ضعیفانِ دلیں — قوت از اسبابِ خُسرانِ دلیں

---

۵۱ دستور۔ شریعت۔ ۵۲ تارک اللحم۔ گوشت کا تارک ۵۳
اعمیٰ۔ اندھا۔ نابینا۔ ۵۴ خسران۔ گھاٹا۔ خسارہ۔

جستجوے عظمت و سطوت شراست
تنگدستی از امارت خوشتر است

برقِ سوزاں در کمینِ دانہ نیست
دانہ گر خرمن شود افسانہ نیست

ذرہ شو صحرا مشو گر عاقلی
تا ز نورِ آفتابے برخوری

آنکہ می نازی بہ بحرِ گوسفند
ذبحِ کن خود را کہ باشی ارجمند

زندگی را می کند ناپایدار
جبر و قہر و انتقام و اقتدار

سبزہ پامال است و زید باز باز
خوابِ مرگ از دیدہ شوید باز باز

غافل از خود شو گرفتارِ زمان
گر ز خود غافل نۂ! دیوانۂ

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
تا رسد فکرِ تو بر چرخِ بلند

ایں علف زارِ جہاں ہیچ ستیہیچ
تو بریں مومہ مہ اے نا دل پیچ

خیلِ شیریں از سخت کوشی خستہ بود
دل بدِ وقتِ تن پرستی بستہ بود

آمدش ایں پند خواب آور پسند
خورد از خامی فسونِ گوسفند

آنکہ کردے گوسفندیں را شکار
کرد دیں گوسفندی اختیار

با پلنگاں سازگار آمد علف
گشت آخر گوہرِ شیری خزف

از علف ایں ستی و ذلت ماند
ہیبتِ چشمِ شرر افشاں نماند

دل بتدریج از میانِ سینہ رفت
جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت

آں حسینانِ کوششِ کامل نماند
آں تقاضائے عملِ صوں نماند

اقتدار و عزم و استقلال و فتوت
اعتبار و عزّت و اقبال و فقر

پنجہ ہائے آہنین بے زور شد
مُردہ شد دلہا و تن ہا گور شد

زورِ تن کاہید و خوفِ جان فزود
خوفِ جان سرمایۂ ہمت رُبود

صد مرض پیدا شد از بے ہمتی
کوتہ دستی بیدلی دُوں فطرتی

شیرِ بیدار از فسونِ میش خفت
انحطاطِ[1] خویش را تہذیب گفت

---

[1] انحطاط روحانی اور جسمانی تنزل۔

در معنی اینکه افلاطونِ یونانی که تصوف و ادبیات اقوام

اسیر افکارِ او شریم نپذیرفته‌اند

مسلکِ سفندی رفته است و از تخیلاتِ او احتراز جسته است

راہبِ اوّل افلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم

زخشِ او در ظلمتِ معقول گم — در گلستانِ وجود افگندہ سُم

۱؎ زخش = گھوڑا۔ ظلمت معقول۔ فلسفے کی تاریکی۔

آنچنان افسونِ نامحسوس خورد
اعتبار از دست و چشم و گوش برد

گفت تسخیرِ زندگی در مردن است
شمع را صد جلوه از افسردن است

بر تخیلهائے ما فرمانرواست
جامِ او خوابِ آور و گیتی رباست

گوسفندے در لباسِ آدم است
حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است

عقلِ خود را بر سرِ گردون رساند
عالمِ اسباب را افسانه خواند

کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات
قطعِ شاخِ سرو عیبِ شاخسات

فکرِ فلاطون نسیان را سوگفت
حکمتِ او بود را نابود گفت

فطرتش خواهید و خوابے آفرید
چشمِ هوشِ او سرائے آفرید

بسکہ از ذوقِ عمل محرومِ بود
جانِ او واقفتہ معدومِ بود

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت [1]
خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است
مردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است

آہوِ شب بے بہرہ از لطفِ حرم
لذتِ رفتار کے بیند حرم

شبنمش از طاقتِ دیدم بے نصیب
طائرش را سینہ از دم بے نصیب

[1] اس شعر میں افلاطون کے مشہور مسئلہ اعیان کی طرف اشارہ ہے جس پر ارسطو نے نہایت عمدہ تنقید کی ہے افسوس ہے، کہ اس مسئلہ کی توضیح اس جگہ ناممکن ہے فارابی نے الجمع بین الرائیں میں ارسطو اور افلاطون کو ہم خیال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو میرے نزدیک ناکام رہی ہے۔ ملا ہادی سبزواری نے جو حال کے ایرانی حکماء میں ہیں اپنی کتاب اسرار الحکم میں زیادہ تر افلاطون کا تتبع کیا ہے عربی اور فارسی جاننے والے ناظرین ان کتب کی طرف توجہ کریں انگریزی دانوں کو فلسفہ مغرب کی کسی انگریزی تاریخ سے ان مسائل کی حقیقت مختصر طور پر معلوم ہو جائیگی +

ذوقِ دیدن نہ دارد دانش — از تماشا نہ خیزد دانش

راہبِ ما چارہ غیر از رم نداشت — طاقتِ غوغائے این عالم نداشت

دل بسوزِ شعلۂ افسردہ بست — نقشِ آن دنیائے افیون خوردہ بست

از نشیمن سوئے گردوں پر کشود — باز سوئے آشیان نامد فرود

در خمِ گردوں خیالِ گم شدست — من ندانم در دیا خم یا خشت

قوم ہا از سکر آدم موم گشت — خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

در حقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیه

گرم خون انسان ز داغ آرزو
آتش این خاک از صراع آرزو

از تمنا می‌شود جام حیات
گرم خیز و تیز گام امد حیات

زندگی مضمون تسخیر است و بس
از زر و افسون تسخیر است و بس

زندگی صید افگن دام آرزو
حسن را از عشق پیغام آرزو

از چه رو خیز و تمنا دم بدم
این نوای زندگی را زیر و بم

هر چه با خوب و زیبا شد جمیل
در بیابان طلب مار است و میل

نقشِ او محکم نشیند در دلت
آرزوها فی سرینند در دلت

حسنِ خلّاقِ بهارِ آرزوست
جلوه‌اش در روزگارِ آرزوست

بیضهٔ شاهینِ تبلی از اثرِ حسن
خیزد از نیسانیِ او انوارِ حسن

از نگاهش خوب گردد خوب تر
فطرت از افسونِ او محبوب تر

از دویدن بلبلِ نوآموخت است
غازه‌اش رخسارِ گل افروخت است

سوزِ او اندر دلِ پروانه‌ها
عشق را رنگین ازو افسانه‌ها

بحر در بر پوشید در آبِ گلش
صد جهانِ تازه مضمر در دلش

در دماغش تا دمیدند لاله‌ها
ناشنیده نغمه‌ها هم ناله‌ها

طرفه افسونِ نقشِ او بُرد دلم
خامه اش شکوه ها بموئے میکند

فکرِ او با ماه و انجم هم نشین
رشت را با آشنا خوب آفرین

خضر و ظلمات و آبِ حیات
زنده تر از آبِ چشمش کائنات

ما گدایانیم و خوانِ ما دهم
درهٔ منزل ز پا افتاده ایم

عندلیب او نوا پرداخت است
حیلهٔ از بهرِ ما انداخت است

ناکشد ما را بفردوسِ حیات
حلقهٔ کامل شوقِ قوسِ حیات

کاروانها از درِ اندیشگام زن
در پیِ آوازِ نایش گام زن

چون نسیمش در ریاضِ ما وزد
نرمک اندر لاله و گل می خزد

از فریب او خود فرزندگی
خود حساب[1] و ناشکیبا زندگی

اہلِ عالم را صلا بر خوان کند
آتشِ خود را چو با دارزان کند

وائے قومے کز اجل گیرد برات
مشعرش واپس[2] شد از ذوقِ حیات

خویش نا ئید زشت را ئینہ اش
در جگر صد نشتر از نوشینہ اش

بوئے او تازگی از گل برد
ذوقِ پرواز از دلِ بلبل برد

سُست اعصابِ تو از افیون او
زندگانی قیمتِ مضمون او

[1] خود حساب۔ محاسبِ نفس کرنے والا [2] واپس گردانی کرنا

می رباید ذوقِ عنائی زسر — جرّہ شاہیں ازدمِ سردش تذرو

ماہی و ارنسینہ تا سردم است[۱] — چوں بناتِ آشیانِ اندریم است

از تو بر ناخُدا فسوں زند — کشتیش در قعرِ دریا افگند

نغمہ ہائش از دلت درد و شبات — مرگ را از سحرِ او دانی حیات

دایۂ[۲] ہستی زجانِ تو برد — لعلِ عنّابی زکانِ تو برد

چوں زمانیاں پیر نیک و بد را — می کند مذموم ہر محمود را

۱؎ بناتِ آشیانی دریم سمندر کی تین پریاں جن کو عربی میں بنات البحر اور انگریزی میں سائرنز کہتے ہیں ملاحوں کے توہمات کے رو سے اُن کا آدھا جسم مچھلی کا ہے اور آدھا انسان کا۔ اور جہازران انکی خوش آوازی سے بے راہ ہو کر غرق ہوتے ہیں ۲؎ دایہ۔ خواہش آرزو۔

دریم اندیشه اندازد ترا
از عمل بیگانه می سازد ترا

خشه وحشا از کلاهش خشه تر
انجمن از دودِ حاشش خشه تر

جوئے بر قے نیست در نیسانِ او
یک سرابِ رنگ و بو بستانِ او

حُسنِ او را با صدا کار نیست
در بمش جز گوهرِ نفطار نیست

خواب را خوشتر بیدی آید ہمے
آتشِ ما از نفسہایش فسرد

قلبِ سموم از سردیِ ملبلش
خفتہ مارے زیرِ انبارِ گلش

از خمِ مینا و جامش انحذر
از مے آئینہ فامش انحذر

اے ز پا افتادہ صہبائے تو
صبح تو از مشرقِ مینائے تو

اے دلت از نغمہ ہایش سرد و جوش
از رہِ قاتل خوردۂ از راہِ گوش

اے ذلیلِ انبساط اندازِ تو
از نوا افتادہ تارِ سازِ تو

آن چنان نازک رگ از تن ساختی
در جہانِ ننگِ مسلمانی شدی

از رگِ گل می تواں بستن ترا
از نسیمے می تواں خستن ترا

عشق سوز و گشتہ از فریادِ تو
زشت رویتہا از زیبا دادِ تو

زر ز آزارِ تو رخسارِ او
سروری تو بردہ از نارِ او

خستہ جاں از خستہ جانہائے تو
ناتواں از ناتوانیہائے تو

گریهٔ طفلانه در پیمانه اش
شکفتِ آهِ متاعِ خانه اش

سرخوشش از در یوزهٔ می خانه ها
جلوه زد در وزنِ کاشانه ها

ناخوشی افسردهٔ آزردهٔ
از لگد کوبِ نگهبان مردهٔ

از غمان مانند نی کاهیدهٔ
از فلک صد شکوه بر لب چیدهٔ

لابه کیش جوهر آئینه اش
تا توانی هم دم و همسینه اش

آبِ سخت و زیرِ دست و دون نهاد
ناسزا و نا امید و نامراد

شیونش از جانِ تو سر می برد
لطفِ خوابِ دیدهٔ همسایه برد

وای بر عشقی که نارا و فسرد
در حرم زائید و در بت خانه مرد

اے میانِ کیمیاتِ نقدِ سخن
بر عیارِ زندگی او را بزن

فکرِ روشن عمل را رہبر است
چون درخشد زندگی پاینده تر است

فکرِ صالح در ادب می باید
رجعتے سوئے عرب می باید

دل بہ سلمائے عرب بایدسپرد
تا دمد صبحِ حجاز از شامِ کرد[1]

از چمن زارِ عجم گل چیدۂ
نو بہارِ ہند و ایراں دیدۂ

اندکے از گرمیِ ما خود بسوز
بادۂ دیرینہ از خُم ما بنوز

[1] سلمیٰ ادبیاتِ عرب میں معشوقہ کا نام ہے دوسرے مصرع میں شیخ حسام الحق ضیاء الدین رح کے منقولہ "ہیئت کردیا صبحت عربیا" کی طرف اشارہ ہے ÷

سرکے اندر برگِ مشہ تن دمے با صرصرے گرمشہ

مدتے غلطیدۂ اندر حریر خو بکن با پاسِ دہ ہم شبے گیر

قمریہا بر لالہ پا کوبیدۂ عارضِ از شبنم چو گل شوئیدۂ

خویش را بر یکِ سوزاں ہم بزن غوطہ اندر چشمۂ زمزم بزن

مثلِ بلبل در دِ شیون تا کجا در چمن زاراں نشیمن تا کجا

اے ہما از بہرِ دامت ارجمند آشیانے ساز بر کوہِ بلند

آشیانے برق تند در بری از کنامِ خرہ بازاں بر تری

تا شوی در خورد پیکارِ حیات از تسلم جاں سوز و زارِ حیات

در بیان آنکه تربیتِ خودی را سه مرحله است

مرحلهٔ اوّل را اطاعت و مرحلهٔ دوم را ضبطِ نفس و مرحلهٔ سوم را نیابت الٰهی میدانند

مرحلهٔ اوّل اطاعت

خدمت و محنت شعارِ اشتر است
صبر و استقلال کارِ اشتر است

گامِ او در راهِ کم عو غاستے
کاروان را زورقِ صحراستے[1]

[1] زورق کشتی۔

نقشِ پائے کش فتادہ بہتر از سعیِ بلند ۔۔۔ کم خور و کم خواب و محنت پیشہ باش اے ہوشمند

راکبِ وامانده منزل می برد ۔۔۔ پائے کوباں سوئے منزل می رود

خوش از کیفیتِ رفتارِ خویش ۔۔۔ در سفر صابر بسازِ سوارِ خویش

تو ہم از بارِ فریضہ سر متاب[1] ۔۔۔ بر خوری از غنچۂ حسن الماب

ورنہ طاعت کوشش اے غفلت شعار[2] ۔۔۔ می شود از جبر پیدا اختیار

ناکس از فرمان پذیری کس شود ۔۔۔ آتش ار باشد ز طغیاں خس شود

---

[1] تلمیح ہے آیہ قرآنی کی طرف۔

[2] اس شعر میں الہیات اسلامیہ کے مشہور مسئلہ جبر اختیار کی طرف اشارہ ہے مقصود یہ ہے۔ کہ اعلےٰ اور صحیح حریت اطاعت یعنے پابندی فرایض سے پیدا ہوتی ہے۔

هر که تسخیر مہ و پروین کند
خویش را زنجیری آئین کند

بادِ را زندان گل خوشبو کند
قید مورانا فسہ آہو کند

می ندانم آخر سوئے منزل قدم
پیشِ آئینے نہ تسلیم خم

سبزہ بر دینِ نمو روئیدہ است
پائمال از ترکِ آل دیدہ است

لالہ پیہم سوختن قانونِ او
بر جہیدا ندر رگِ او خونِ او

قطرہا دریاست از آئینِ وصل
ذرہا صحراست از آئینِ وصل

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی
تو چرا غافل ازیں ساماں روی

یارِ ما آزاد دستورِ قدیم
زینتِ پاکن ہماں زنجیرِ سیم

شکوہ رنجِ سخنی ہائے من و شما

از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرو

مرحلۂ دوم ضبطِ نفس

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است — خود پرست و خود سوار و خود سر است

مردِ شو آور زمامِ و کعبہ رو — تا شوی گوہر اگر باشی خزف

ہر کہ بر خود زیست فی مانش رواں — می شود در مہ پذیرد از دگراں

طرحِ تعمیرِ تو از گل ریختند — با محبت خوف را آمیختند

خوفِ دنیا خوفِ عقبیٰ خوفِ جاں — خوفِ آلامِ زمین و آسماں

حُبِّ مال و دولت و حُبِّ وطن — حُبِّ خویش و اقربا و حُبِّ زن

امتزاجِ ما و طین پرورد است — کشتهٔ فحشا هلاکِ منکر است

تا عصائے لا اِلٰه داری بدست — هر طلسمِ خوف را خواهی شکست

هر که حق باشد چو جانش اندر تنش — هم نگردد پیشِ باطل گردنش

خوف را در سینهٔ او راه نیست — خاطرش مرعوبِ غیرِ الله نیست

هر که در تسلیمِ لا آباد شد — فارغ از بندِ بتان و اولاد شد

می کند از ما سوی قطعِ نظر — می نهد ما طور بر حلقِ پسر

بایکی مثلِ ہجومِ لشکر است
جانِ بخشم و زبا در زاں تر است

لا الٰہ باشد صدف گوہر نما
قلبِ مسلم راحجِ اصغر نما

در کفِ مسلم مثالِ خنجر است [1]
قاتلِ فحشا و بغی و منکر است

روزہ بر جوع و عطش شنجول زند [2]
خیبرِ تن پر دری را بشکند

مومناں را فطرت افروزد حج
ہجرت آموز و وطن سوزد حج

طاعتے سرمایۂ جمعیتے
ربطِ اوراقِ کتابِ ملتے

حُبِ دولت را فنا سازد زکوٰۃ
ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

---

[1] الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء الخ (آیہ شریفہ)
[2] جوع و عطش بھوک۔ پیاس۔

دِل زِ حُبِّ تُنفِقُوا محکم کُند[۱]
زر فزاید اُلفتِ زرکم کُند

ایں سبابِ شیخ کامِ تُست
پختہ محکم اگر اسلامِ تُست

اہلِ قوّت شو زوردِ باقوی
تا سوارِ اشتر خاکی شوی

مرحلۂ سوم نیابتِ الٰہی

گر شتربانی جہانبانی کُنی
زیبِ سر تاجِ سُلیمانی کُنی

[۱] لن تنالوا البرّ حتّٰی تنفقوا (آیہ شریفہ)

تا جہاں باشد جہاں آراشوی ۔۔۔ تا جدارِ مُلکِ لاسیلی[1] شوی

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است ۔۔۔ بر عناصر حکمراں بودن خوش است

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است ۔۔۔ ہستی او ظلِّ اسمِ اعظم است

از رموزِ خیر و کُل آگہ بُود ۔۔۔ در جہاں قائم بامرُ اللہ بُود

خیمہ چون در وسعتِ عالم زند ۔۔۔ این بساطِ کہنہ را برہم زند

فطرتش معمورئ می خواہد نمود ۔۔۔ عالمے دیگر بیارد در وجود

صید جہاں مثلِ جہانِ خیر و کُل ۔۔۔ روید از کشتِ خیالِ او چو گُل

[1] مُلکِ لاسیلی یعنی وہ مُلک جو زمانے کے دست بُرد سے ہمیشہ محفوظ رہے تلمیح ہے آیۂ قرآنی کی طرف

پختہ سازد فطرتِ ہر خام را
از حرم بیرون کند اصنام را

نغمہ زا تارِ دلِ از مضرابِ او
بہرِ حق بیدار ازِ خوابِ او

شیب را آموزد آہنگِ شباب
می دہد ہر چیز را رنگِ شباب

نوعِ انساں را شیرِ ہم تدبیر
ہم سپاہی ہم سپہگر ہم امیر

مدعائے علم الاسماستے
سرِ سبحان الذی اسراستے

از عصا دستِ سفیدش محکم است
قدرتِ کامل بعلمش توام است

۱؎ شیب - بڑھاپا۔ ۲؎ تلمیح ہے آیاتِ قرآنی کی طرف ۔

۳؎ دستِ سفید - حضرت موسیٰؑ کا روشن ہاتھ ۔

چون عناں گیرد بدستِ آں شہسوار
تیز تر گردد سمندِ روزگار

خشک سازد ہیبتِ او نیل را
می برد از مصر اسرائیل را[1]

از قمِ او خیزد اندر گورِ تن
مُردہ جانہا چوں صنوبر در چمن

ذاتِ او توجیہِ ذاتِ عالم است
از جلالِ او نجاتِ عالم است

ذرہ خورشید آشنا از سایہ اش
قیمتِ ہستی گراں از مایہ اش

زندگی بخشد سرا عجازِ عمل
می کند تجدیدِ اندازِ عمل

جلوہ ہا خیزد ز نقشِ پائے او
صد کلیم آید برونِ وادیِ سینائے او

[1] اس شعر میں حضرت موسیٰ ؑ کے قصّے کی طرف تلمیح ہے۔

زندگی را می کند تفسیرِ نو
می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو

ہستیِ مکنونِ او رازِ حیات
نغمۂ نشنیدۂ سازِ حیات

طبعِ فطرت عمرہا در خون تپید
تا دویدِ ذاتِ او زوں شود

مشتِ خاکِ ما سرِ گردوں رسید
زیں غبار آں شہسوار آید پدید

غنچۂ ما گلستاں در دامن است
چشمِ ما از صبحِ فردا روشن است

خفتہ در خاکسترِ امروز ما
شعلۂ فردائے عالم سوز ما

اے سوارِ شہپِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو
در سوادِ دیدہ ہا آباد شو

آشتی اقوام را خاموش کن
نغمهٔ خود را بهشتِ گوش کن

خیز و قانونِ اخوت ساز ده
جامِ صهبائے محبت باز ده

باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگجویاں را بده پیغامِ صلح

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

رنجت از جورِ خزاں برگِ شجر
چوں بہاراں ریاضِ ما گذر

سجده‌هائے طفلکِ ما و پیر
از جبینِ شهر ما بسارِ ما بگیر

از وجودِ تو سرافرازیم ما
پس به سوزِ این جهاں سازیم ما

در شرحِ اسرارِ اسمائے علی مرتضیٰؓ

مُسلمِ اوّل شہِ مرداں علیؓ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ

از ولائے دودمانش زندہ ام
در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام

نرگسم وارفتۂ نظارہ ام
در خیابانش چو بُو آوارہ ام

زمزم ار جوشد ز خاکِ من ازوست
مے اگر ریزد ز تاکِ من ازوست

خاکم و از مہرِ او آئینہ ام
می تواں دیدن نوا در سینہ ام

از رخِ او فال پیغمبر گرفت
ملتِ حق از شکوہش فر گرفت

قوتِ دینِ مبیں فرمودہ اش
کائناتِ آئینہ پرداز دودہ اش

مُرسلِ حق کرد نامش بُوتراب
حق اللہ خواند در اُمّ الکتاب

ہر کفِ خاکے رموزِ زندگیست
سرِّ اسمائے علیؓ داند کہ چیست

خاکِ تاریکے کہ نامِ او تن است
عقل از بیدادِ او در شیون است

فکرِ گردوں رس زمیں پیمائے او
چشمِ کور و گوشِ ناشنوائے او

از ہوسِ تیغِ دو رو دارد سبد
رہروانِ را دلِ بیرہزن شکست

شیرِ حق این خاک را تسخیر کرد
این گلِ تاریک را اکسیر کرد

مُرتضیٰ کز تیغِ او حق روشناس
بُوتراب از فتحِ اقلیمِ تن است

مردِ کشور گیر از کرّاری است — گوهرش را آبروِ خودداری است

هر که در آفاق گردد دیوتر — لاله باز گرداند مغرب آفتاب

هر که زیرِ مرکبِ تن تنگ دست — چون نگین خاتمِ دولت نشست

زیرِ پا پیشِ اینجا شکوهِ خیبر است — دستِ او آنجا قسیمِ کوثر است

از رخِ او گاهی یدُ اللّٰهی کند — از یدِ اللّٰهی شهنشاهی کند

ذاتِ او دروازهٔ شهرِ علوم — زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم

حکمرانی ماید شدن بر خاکِ خویش — تا مهِ روشن خوری از تاکِ خویش

لطف معجزهٔ عدم تسبیحِ خورشید ۱۲

خاک گشتن نہ پئے بندگی است ۔۔۔ خاک را آب شو کہ ایں مردانگی است

سنگ شو اے ہمچو گل نازک بدن ۔۔۔ تا شوی بنیادِ دیوارِ چمن

از گلِ خود آدمے تعمیر کن ۔۔۔ آدمے را عالمے تعمیر کن

گر بنا سازی نہ دیوار و در ے ۔۔۔ خشت از خاکِ تو بندد دیگرے

اے جوئے چرخ تا ہنجار سنگ ۔۔۔ جامِ تو فریادیِ بیداد سنگ

نالہ و فریاد و ماتم تا کجا ۔۔۔ سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات ۔۔۔ لذتِ تخلیق قانونِ حیات

۱؎ حضرت علی مرتضیٰ کی کنیت (ابوتراب یعنے مٹی کا باپ) کیطرف تلمیح ہے

خیز و خلّاقِ جهانِ تازه شو
شعله در بر کن خلیل آوازه شو

با جهانِ نامساعد ساختن
هست در میدان سپر انداختن

مردِ خود دار آنکه باشد پخته کار
با مزاجِ او بسازد روزگار

گر نه سازد با مزاجِ او جهان
می شود جنگ آزما با آسمان

برکند بنیادِ موجودات را
می دهد ترکیبِ نو ذرّات را

گردشِ ایام را برهم زند
چرخِ نیلی فام را برهم زند

می کند از قوّتِ خود آشکار
روزگارِ نو که باشد سازگار

در جهان نتوان اگر مردانه زیست
همچو مرداں جاں سپردن زندگیست

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم
زورِ خود را از مہماتِ عظیم

عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چون خلیلؑ از شعلہ گل چیدن خوش است

ممکناتِ قوتِ مردانِ کار
گردد از مشکل پسندی آشکار

حربۂ دونِ ہمتاں کین است و بس
زندگی را ایمن است و ایمن است و بس

زندگانی قوتِ پیداستے
اصلِ او از دودِ تیلاستے

عفوِ بیجا مدمِ خونِ حیات
سکتۂ دیوثیِ موزونِ حیات

ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است

ناتوانی زندگی را رہزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است

از مکارم ندرتِ او تنہی است
شیرش از بہرِ دمادم فربہی است

ہوشیارا اے صاحبِ عقلِ سلیم
در کمینہا می نشیند این غنیم

گر خردمندی فریبِ او مخور [1]
مثلِ حربا با ہر زماں رنگش دگر

شکلِ او اہلِ نظر نشناختند
پردہ ہا بر روئے او انداختند

گاہ او را رحم و نرمی پردہ دار
گاہ می پوشد ردائے اِنکسار

گاہ او مستور در مجبوری است
گاہ پنہاں در تہِ معذوری است

چہرہ در شکلِ تن آسانی نمود
دل ز دستِ صاحبِ قوت ربود

[1] حربا۔ ایک قسم کا جانور جو ہر گھڑی اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے

باتوانائی صداقت توام است
اگر خود آگاهی همیں جامِ جم است

زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

مُدّعی گر مایه دار از قوت است
دعویٰ او بے نیاز از حجت است

باطل از قوت پذیرد شانِ حق
خویش را حق داند از بطلانِ حق

از کُنِ او زہر کوثر می شود
خیر را گوید شر می شود

اے ز آدابِ امانت بے خبر!
از دو عالم خویش را بہتر شمر!

از رموزِ زندگی آگاہ شو
ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو

چشم و گوش و لب کشا اے ہوشمند
گر نہ بینی راہِ حق بر من بخند

حکایتِ نوجوانے از مریدانِ پیرِ حضرت

سیّد مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ آمدہ

از ستمِ اعدا فریاد کرد

سیّد ہجویر مخدومِ اُمم
مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم

بندہائے کوہسار آسان شکست
در زمینِ ما تخمِ سجده ریخت

۱؎ پیرِ سنجر خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت ہجویری کی مزار پر شریف لائے تھے

عهدِ فاروقؓ از جمالش تازه شد — حق ز حرفِ او بلند آوازه شد

پاسبانِ عزتِ اُمُّ الکتاب — از نگاهش خانهٔ باطل خراب

خاکِ پنجاب از دمِ او زنده گشت — صُبحِ ما از مهرِ او تابنده گشت

عاشق و هم قاصد و هم صیدِ عشق — از جبینش آشکار است سرِّ عشق

داستانے از کمالش سر کنم — گلشنے در غنچهٔ مضمر کنم

نوجوانے قامتش بالا چو سرو — وارِدِ لاہور شد از شہرِ مرو

رفت پیشِ سیدِ الاجداد — نار و باید ظلمتش را آفتاب

گفت محصورِ صفِ اعدا ستم — در میانِ سنگہا مینا ستم

یا مَن آموزانِ شہ گردوں مکاں
زندگی کردن میانِ دشمناں

پیرِ دانائے کہ در آتش جمال
بستہ پیمانِ محبت با جلال

گفت آنے نامحرم از رازِ حیات
غافل از انجام و آغازِ حیات

فارغ از اندیشۂ اغیار شو
قوتِ خود را بیدۂ بیدار شو

سنگ چوں مَن خود گمانِ شیشہ کرد
شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد

ناتوانِ خود را اگر رہرو شمرد
نقدِ جانِ خویش را رہزن سپرد

تا کجا خود را شماری ماءِ و طین
از گلِ خود شعلۂ طور آفرین

لہ ماءِ و طین - پانی اور مٹی -

با عزیزاں گران بودن چرا
شکوہ سنجِ دشمنان بودن چرا

راست میگویم عدد هم یارِ تست
هستیِ او رونقِ بازارِ تست

هر که دانائے مقاماتِ خودی است
فضلِ حق داند اگر دشمن قوی است

کشتِ افسانِ را عدد باشد سحاب
ممکناتش را انگیزد در خواب

سنگ آب آست اگر همت قوی است
سیل را پست بلند جاده چیست

سنگ شد گردِ فسانِ تیغِ عزم
قطعِ منزل امتحانِ تیغِ عزم

مثلِ حیوانِ خوردن سود چیست
گر نجود محکم نه بودن چه سود

خویش را چون از خودی محکم کنی
تو اگر خواهی جهان هم کنی

اگر فنا خواهی ز خود آزاد شو
اگر بقا خواهی بخود آباد شو

چیست مردن از خودی غافل شدن
توجیه پنداری فراقِ جان و تن

در خودی کن صورتِ یوسف مقام
از اسیری تا شهنشاهی خرام

از خودی اندیش و مردِ کار شو
مردِ حق شو حاملِ اسرار شو

شرح راز از داستانها میکنم
غنچه از زورِ نفس وا میکنم

خوشتر آن باشد که سرِ دلبران
گفته آید در حدیثِ دیگران

حکایت طائرے کہ از تشنگی بیتاب بود

طائرے از تشنگی بیتاب بود
در تنِ او دم بمثالِ موجِ دود

ریزۂ الماس در گلزار دید
تشنگی نظارۂ آب آفرید

از فریبِ ریزۂ خورشید تاب
مرغِ نادان سنگ را پنداشت آب

مایہ اندوزِ نم از گوہر نشد
زد بر و منقار و کامش تر نشد

گفت الماس اے گرفتارِ ہوس
تیز بر من کردہ منقارِ ہوس

قطرۂ آبے نیم ساقی نیم
من برائے دیگراں باقی نیم

قصدِ آزارم کُنی دیوانۂ

از حیاتِ خود نما بیگانۂ

آبِ من منقارِ مرغانِ شکند
آدمی را گوہرِ جان شکند

طائرِ زالماس کامِ دل نیافت
روئے خویش از ریزۂ تابندہ تافت

حسرت اندر سینہ اش آباد گشت
در گلوئے او نوا فریاد گشت

قطرۂ شبنم سرشکِ شاخِ گُل
تافت مثلِ اشکِ چشمِ بلبلے

تابِ او محوِ سپاسِ آفتاب
لرزہ بر تن از ہراسِ آفتاب

کوکبِ رم خوردۂ گردوں زادۂ
یک دم از ذوقِ نمود استادۂ

صید یک غنچہ و گُل خوردۂ
بہرۂ از زندگی نابردۂ

مثلِ اشکِ عاشقِ دلدادہ

مُرغِ مضطر ریزِ شاخِ گُل رسید

ایکہ می جستی دشمن جاں رہی

چُوں ستارہ تشنگی طائر گدا

قطرہ سخت اندام و گوہر خو نبود

غافل از خفتہ خودی کیدم مشو

پختہ فطرت صُورتِ سُکہ بباش

خیز و بشنو از نیِ ایجادِ خویش

زیبِ گلشن چکید آمادہ

در دہانش قطرۂ شبنم چکید

از تو پرسم قطرہ یا گوہر منی؟

از حیاتِ دیگرے سرمایہ ساخت

ریزۂ الماس بُود و دانہ بود

ریزۂ الماس شو شبنم مشو

حاملِ صد بحرِ دریا بار باش

بیستم از بستنِ سیماخویش

نغمهٔ پیدا کن از تارِ خودی
آشکارا ساز اسرارِ خودی

حکایتِ الماس و زغال

از حقیقت باز بکشایم در
با تو می گویم حدیثِ دیگرے

گفت با الماسِ معدن زغال
اے امینِ جلوه هائے لازوال

همدم و همدست و همدیم هست و بود
در جهان اصل و وجود ما یکیست

من بکاں میرم ز دردِ ناکسی
تو سرِ تاجِ شهنشاهاں رسی

قدرِ من از دیدگلی کمتر ز خاک
از جمالِ تو دلِ آئینہ چاک

روشن از تاریکیِ من محجر است
پیکرِ کمالِ جوہرم خاکستر است

پشتِ پا ہر کس مرا بر سر زند
بر متاعِ ہستیم اخگر زند

بر سرِ سامانِ من بادِ دگر است
برگ و سازِ ہستیِ من داغِ حسرت است؟

موجۂ دودے بہم پیوستۂ
مایۂ دارِ یک شرارِ رستۂ

مثلِ نکہت روئے تو ہم خوئے تو
جلوہ ہا خیز از رہِ پہلوئے تو

گاہ نورِ دیدۂ قیصر شوی
گاہ زیبِ دستۂ خنجر شوی

گفت الماس اے رفیقِ کم نگہ بین
تیرہ خاک از زندگی گردد نگین

تا به پیرامونِ خود در جنگ شد
به گُسسته از پیکار مثلِ سنگ شد

پیکرم از پختگی ذوالنور شد
سینه‌ام از جلوه‌ها معمور شد

خورگشتی از وجودِ خامِ خویش
سوختی از تشنهٔ اندامِ خویش

فارغ از خوف و غم و وسواس باش
پخته مثلِ سنگِ شوالماس باش

می‌شود از وی دو عالم مستنیر
هر که باشد سخت‌کوش و سخت‌گیر

مشت خاکے اصلِ سنگِ سودا است
گوہرِ از جیبِ حرم بیرون زدہ است

رتبه‌اش از طور بالاتر شد است
بوسه‌گاهِ اسود و حمر شد است

وصلِ آبِ و گِل حیاتِ زندگی است
تا توانی کاسبِ پختگی است

حکایتِ شیخ و برہمن و مکالمۂ گنگا و ہمالہ

در معنی اینکہ تسلسلِ حیاتِ ملّیہ از محکم گرفتنِ روایاتِ مخصوصۂ ملّیہ می باشد

در نبارس بر ہمندے محترم
سر فرو اندر یمِ بود و عدم

بہرہ وافر ز حکمت داشتے
با خدا جویاں ارادت داشتے

۱؎ برہمند۔ مزید علیہ برہمن کا ہے ۔

ذہنِ او گیرائیِ فکرت کوشش بود
باشریا عقلِ او ہمدوش بود

آشیانش صورتِ عنقا بلند
مہر و مہ بر سلسلۂ فکرش سپند

مدتے مینائے او در خون نشست
ساقیِ حکمت بجامش مے نبست

در ریاضِ علم و دانش دام چید
چشمِ دامش طائرِ معنی ندید

ناخنِ فکرش نخود آلود ماند
عقدۂ بود و عدم بگشودہ ماند

آہ بر لب شاہدِ حرمانِ او
چہرۂ غماز دلِ حیرانِ او

رفت روزے نزدِ شیخِ کاملے
آنکہ اندر سینہ پروردے دلے

گوشِ او بر گفتارِ او فرسودہ داد
بر لبِ خود مہرِ خاموشی نہاد

گفت شیخ اطائفِ چرخِ بلند
اندکے عہدِ وفا بر خاک بند

تا شدی آوازۂ صہبا و دشت
فکرِ بے باکِ تو از گردوں گذاشت

باز میں در سنائے گردوں نورد
در تلاشِ گوہرِ انجم مگرد

من نگویم از بتاں بیزار شو
کافری شائستۂ زنار شو

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن
پشتِ پا بر مسلکِ آبا مزن

گر ز جمعیتِ حیاتِ ملت است
کفر ہم سرمایۂ جمعیت است

تو کہ ہم در کافری کامل نۂ
در حریمِ طوفِ دل نۂ

ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور
نور آور من ز ابراہیم دور

قیسِ ما سودائیِ محمل نشد | در جنونِ عاشقی کامل نشد

مرد چون شمعِ خودی اندر وجود
از خیالِ آسمان سیما چه سود

آب زد دامانِ کهسار چنگ | گفت روزی با همالانِ درنگ

اے ز صبحِ آفرینش تاختن | پیکرت از دوڑها زنار و پوشش

حق ترا با آسمان همراز ساخت | پات محرومِ حرامِ نازساخت

طاقتِ رفتار از پایت ربود | این وقار و رفعت و تمکین چه سود

زندگانی از حرامِ پیهم است | برگ و سازِ هستیِ موج از رم است

کوہ چوں ایں طعنہ از دریا شنید
ہم چو بحرِ آتش از کیں بردمید

گفت اے پہنائے تو آئینہ ام
چوں تو صد دریا درونِ سینہ ام

ایں خرامِ نارسا مانِ فنا ست
ہر کہ از خود رفت شایانِ فنا ست

از مقامِ خود نداری آگہی
ز زیانِ خویش نازی الٰہی

اے ز بطنِ چرخِ گردان زادۂ [۱]
از تو بہتر حاملِ اُفتادۂ

ہستی خود ندرِ قُلزم ساختی
پیشِ ہر نہر نقدِ جاں انداختی

ہم چو گل در گلستاں خود دار شو
بہرِ نشر بوئے گلچیں مرد شو

[۱] ہنود کا عقیدہ ہے کہ ورد گنگا کا سرچشمہ آسمان ہے۔ [۲] نشر۔ پھیلانا

زندگی بر جائے خود بالیدن است — از خیابانِ خمِ دی گلچیدن است

قرنہا بگذشت و من با درد و غم — تو گمان داری کہ دورم از ستم

ہستیم بالید و تا گردوں رسید — زیرِ دامانم ثریّا آرمید

ہستیِ تو بے نشانی در دلم است — در رُوئے من سجدہ گاہِ ایمن است

چشمِ من بینائے اسرارِ فلک — آشنا گوشم ز پروازِ ملک

نازِ سوزِ سرمہ پیہم سوختم — لعل و الماس و گہر را اندوختم

در دو نم سنگ و اندر سنگ نار[۱] — آب را بر نارِ من نبود گذار

[۱] ذرہ - چوٹی ۱۲ — مولینا روم رح بتغیر (الفاظ ۱۲)

قطرہ؟ خود را بپائے خود مریز

در طاطم کوش و با قلزم ستیز

آبِ گوہر خواہ و گوہر ریزہ شو

بہرِ گوشِ شاہدے ویزہ شو

یا خود افزا شو سبک رفتار شو

ابرِ بیتاب انداز و دریا بار شو

از تو قلزم گدیۂ طوفاں کند

شکوہ ہا از تنگیِ داماں کند

کمتر از موجے شمار خویش را

پیشِ پائے تو گذارد خویش را

در بیان اینکه مقصدِ حیاتِ مُسلم اعلائے کلمۃ اللہ است و جہاد اگر محرّک او

جوعُ الارض[1] باشد در مذہبِ اسلام حرام است

فلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ
عشق را ناموس و نام ننگ دہ

طبعِ مسلم از محبت قاہر است
مُسلم عاشق نباشد کافر است

[1] جوع الارض تسخیر ممالک [2] صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۔ [3] قاہر غالب

تابعِ حق بندگیش نادیدنش — خوردنش نوشیدنش خوابیدنش

در رضائیش مرضئ حق گم شود — "این سخن کے باورِ مردم شود"

خیمہ در میدان الّا اللہ زد — در جہاں شاہد علی الناس آمد است

شاہدِ حالش نبی انس و جاں — شاہدے صادق ترین شاہدان

قال را بگذار و با حال آ بزن — نورِ حق بر ظلمتِ اعمال زن

در فیافائے خسروی درویش زی — دیدہ بیدار و خود اندیش زی

قربِ حق از ہر عملِ مقصود دار — تا زنو گردد جلالش آشکار

صلح شر گردد چو مقصود است غیر — گر خدا باشد غرض خنک است خیر

گر نہ گردد حق ز تیغِ ما بلند
جنگ باشد قوم را ما ارجمند

خضرِ شیخ ما میانِ میر دلی
ہر خفی از نورِ جانِ او جلی

بر طریقِ مصطفیٰ محکم پئے
نغمۂ عشق و محبت را نوئے

تربتش اندر میانِ خاکِ شہرِ ما
مشعلِ نورِ ہدایت مہرِ ما

بر درِ او جبہ سا آسمان
از مریدانش شہِ ہندوستان

شاہ تخمِ حرص در دل کاشتے
قصدِ تسخیرِ ممالک داشتے

از ہوس آتش بجاں افروختے
تیغ را اہلِ من مزید آموختے

در دکن ہنگامہ ہا بسیار بود
لشکرش در عرصۂ پیکار بود

رفت پیشِ شیخِ گردون پایہ
تا بگیرد از دعا سرمایہ

مسلم از دنیا سوئے حق رم کند
از دعا تدبیر را محکم کند

شیخ از گفتارِ شہ خاموش ماند
ترمِ درویشاں سراپا گوش ماند

تا مریدے سکۂ سیمیں بدست
لب کشود و مہرِ خاموشی شکست

گفت ایں نذرِ حقیر از من پذیر
اے ز حق آوارگاں را دستگیر

غوطہ ہا زد در خوئے[1] محنت تنم
تا گرہ زد در ہمے را دامنم

گفت شیخ ایں نذر حقِ سلطانِ ماست
آنکہ در پیراہنِ شاہی گداست

---

[1] خوے (تلفظ خَے) پسینہ۔

حکمرانِ مہر و ماہ و انجم است
شاہِ مفلس ترینِ مردم است

دیدہ خوانِ اجانب دوختست
آتشِ جوعش جہانے سوختست

قحط و طاعون تابعِ شمشیرِ او
عالمے ویرانہ از تعمیرِ او

خلق در فریاد از نادارئیش
از تہیدستی ضعیف آزارئیش

سطوتش اہلِ جہاں را دشمن است
نوعِ انساں کاروانِ او رہزنست

از خیالِ خوب و فریب و فکرِ خام
می کند تاراج را تسخیر نام

عسکرِ شاہی و افواجِ غنیم
ہر دو از شمشیرِ جوعِ او دو نیم

۱؎ جوع - بھوک

آتش جانِ گدا جوعِ گداست | جوعِ سلطان ملک و ملت را فناست

هر که خنجر بهرِ غیر الله کشید

تیغِ او در سینهٔ او آرمید

اندرز[1] میر سید نقشبند المعروف بابائے صحرائی که برائے مسلمانانِ هندوستان رقم فرموده است

ایکه مثلِ گل ز گل بالیده ٔ
گو هم از بطنِ خودی زائیده ٔ

از خودی گیر بقا انجام باش
قطره می باش و بحر آشام باش

---

[1] اندرز = نصیحت ۱۲

تو کہ از نورِ خودی تابندہ ئی
اگر خودی محکم کنی پائندہ ئی

سود و بیں جیبِ ہمیں سودا ستے
خواجگی از حفظِ ایں کالا ستے

ہستی و از نیستی ترسیدہ ئی
اے سرت گردم غلط فہمیدہ ئی

چوں خبر دارم ز سازِ زندگی
با تو گویم چیست رازِ زندگی

غوطہ در خود صورتِ گوہر زدن
پس ز خلوت گاہِ خود سر بر زدن

زیرِ خاکستر شرار اندوختن
شعلہ گردیدن نظرہا سوختن

خانہ سوزِ محنتِ چل سالہ شو
خوفِ خود کن شعلہِ جوالہ شو

زندگی از ظوفِ دیگر زیستن
خویش را صیدِ حرم دانستن

پرزن از جذبِ خاک آزاد باش
همچو طائرِ سایۂ افتاد باش

تو اگر طائرِ نۂ اے ہوشمند
بر سرِ غار آشیانِ خود مبند

یکہ باشی در پئے کسبِ علوم
با تو می گویم پیامِ پیرِ روم

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

آنچہ از قصہ اخذ کردم زدم
آنکہ داند در حلب[1] درسِ علوم

پائے در زنجیرِ توجیہاتِ عقل
کشتیش طوفانیِ ظلماتِ عقل

موسیِ بیگانہ سینائے عشق
بیخبر از عشق و از سودائے عشق

[1] ملک شام میں ایک مشہور شہر کا نام ۱۲

از تشکک گفت و از اشراق گفت ۱؎ وز حکم صد گوہرِ تابندہ سفت

عقدہائے قیلِ مشائین کشود ۲؎ نورِ فکرش ہر خفی را وا نمود

گردِ پیشش تو دو انبارِ کتب پربِ او شرحِ اسرارِ کتب

پیر تبریزی ز ارشادِ کمال ۳؎ جستہ راہِ مکتبِ مُلّا جلال

گفت این غوغا و قیل و قال چیست این قیاس و وہم و استدلال چیست

۱؎ تشکک و اشراق - قدیم فلسفہ یونان کے دو اسکول - موخر الذکر فلاطون کے فلسفے کا نتیجہ ہے مسلمانوں میں اس کے جامع اور مرتب شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول تھے جنکو سلطان صلاح الدین رح نے علمائے وقت کے فتوی پر قتل کروا دیا تھا۔

۲؎ مشائین - حکماء کا وہ گروہ جو ارسطو کا متبع ہے

۳؎ کمال - حضرت شیخ کمال الدین جندی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲

مولوی هرمزد نادان لب ببند — بر مقالاتِ خردمندان مخند

پایۂ خویش از مکتبم بیرون مگذار — قیل و قال است این ترا با وجد و کار

قالِ ما از فهمِ تو بالاتر است — شیشهٔ ادراک را روشنگر است

حرفِ ملاشمس را حدت فزود — آتشے از جانِ تبریزی کشود

بر زمین رقصِ نگاهِ او فتاد — خاک از سوزِ دمِ او شعله زاد

آتشِ دل خرمنِ ادراک سوخت — دفترِ آن فلسفی را پاک سوخت

مولوی بیگانه از اعجازِ عشق — ناشناسِ نغمه‌هائے سازِ عشق

گفت این آتش حیات افروختی — دفترِ ارباب حکمت سوختی

گفت شیخ اے مسلمِ زنّار دار
ذوق و حال استیں ترا داد ے چہ کار

حالِ ما از فکرِ تو بالاتر است
شعلۂ ما کیمیائے احمر است

ساختی از برفِ حکمت ساز و برگ [1]
از سحابِ فکرِ تو بارد تگرگ

آتشے افروز از خاشاکِ خویش
شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش

علمِ مسلم کامل از سوز دل است
معنیِ اسلام ترکِ آفل است

چون زِ بندِ آفل [2] ابراہیم رست
در میانِ شعلہ ہا نیکو نشست

[1] تگرگ - اولہ۔ [2] آفل - غروب ہونے والا - زوال پذیر۔
تلمیح آیہ شریفہ لا احب الآفلین کی طرف ۱۲

علمِ حق را در قفا انداختی [1] بہرِ نانے نقدِ دیں در باختی

گرم رو در جستجوئے سُرمہ ا ق واقف از چشمِ سیاہِ خود نۂ

آبِ حیوان از دمِ خنجر طلب از دہانِ اژدہا کوثر طلب

سنگِ اسود از درِ بتخانہ خواہ نافۂ مشک از سگِ دیوانہ خواہ

سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے

مدتے محوِ تگ و دو بودہ ام راز دانِ دانشِ نو بودہ ام

باغباناں امتحانم کردہ اند محرمِ ایں گلستانم کردہ اند

[1] در قفا انداختن - بے پروائی کرنا۔

گلستانے زلالہ زارِ عبرتے
چوں گلِ کاغذ سرابِ نکہتے

تا زبندِ این گلستاں رستہ ام
آشیاں بر شاخِ طوبیٰ بستہ ام

دانشِ حاضر حجابِ اکبر است[1]
بت پرست و بت فروش و تنگدست

پا بزندانِ مظاہر بستۂ
از حدودِ حسن بروں ناجستۂ

در صراطِ زندگی از پا فتاد
بر گلوئے خویشتن خنجر نہاد

آتشے دارد مثالِ لالہ سرد
شعلۂ دارد مثالِ ژالہ سرد

فطرتش از سوزِ عشق آزاد ماند
در جہانِ جستجو ناشاد ماند

---

[1] دانشِ حاضر۔ موجودہ زمانے کے علوم و فنون۔

عشق فلاطونِ علتہائے عقل
بہ شود از نشترش سودائے عقل

جملہ عالم ساجد و مسجودِ عشق
سومناتِ عقل را محمودِ عشق

ایں مئے دیرینہ در میناش نیست
شورِ یارب قسمتِ شبہاش نیست

قیمتِ شمشادِ خود نشناختی
سروِ دیگر را بلند انداختی

مثلِ نے خود را ز خود کردی تہی
بر نوائے دیگراں دل می نہی

اے گدائے ریزہ از خوانِ غیر
جنسِ خود می جوئی از دکانِ غیر

بزمِ مسلم از چراغِ غیر سوخت
مسجدِ او از شرارِ دیر سوخت

از سوادِ کعبہ چوں آہو رمید
ناوکِ صیاد پہلو شش درید

شد پریشاں گردِ گل بوئے خویش
آنے خورد رم کردہ باز آموئے خویش

اے امینِ حکمتِ اُمّ الکتاب
وحدتِ گم گشتۂ خود باز یاب

ما کہ در بابِ حصارِ ملتیم
کاروانِ ترکِ شعارِ ملتیم

سنائی در ینہ ارساغر شکست
بزمِ رندانِ حجازی بر شکست

کعبہ آباد است از اصنامِ ما
خندہ زن کفر است بر اسلامِ ما

شیخ در دشتِ بتاں اسلام باخت
رشتۂ تسبیح از زنار ساخت

پیرہا پیرانہ بیاضِ موشدند
سنجر و بہر کودکانِ کوشدند

دل از نقشِ لا الٰہ بیگانۂ
از صنم ہائے ہوس بُت خانۂ

می شود ہر مو درازے خرقہ پوش
آہ ازیں سوداگرانِ ایں فروش

پا مریداں از روز و شب اندر سفر
از خضر مردِ رہے ملت بخیر

دیدہ ہا بے نور مثلِ نرگس اند
سینہ ہا از دولتِ دل مفلس اند

واعظانِ ہم صفیر فیاں منصب پرست
اعتبارِ ملت بیضا شکست

واعظِ ما چشم بر بت خانہ دوخت
مُفتیِ دینِ مبیں فتویٰ فروخت

چیست یاراں العذر ازیں تدبیرِ ما
رُخ سوئے میخانہ دارد پیرِ ما

الوقت سیف ہے

سبز باد از خاکِ پاکِ شافعی
عالمے سرخوش ز تاکِ شافعی

فکرِ او کوتہ نظر دل چیدہ است
سیفِ بتّر از وقت را نامیدہ است

من چہ گویم سرِّ او شمشیر چیست
آبِ او سرمایہ دار از زندگیست

حرفِ حق مالا بتر از اُمّید بیم
دستِ او بیضا تر از دستِ کلیم

سنگ از یک ضربتِ او تر شود
بحر از محرومیٔ او نم بر شود

۱؎ الوقت سیف ۔ مقولہ ہے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا

در کفِ موسیٰ همیں شمشیر بود
کارِ او با لاتر از تدبیر بود

سینهٔ دریائے احمر چاک کرد
قلزمے را خشک مثلِ خاک کرد

پنجهٔ حیدر کہ خیبر گیر بود
قوتِ او از همیں شمشیر بود

گردشِ گردون گردان دینی است
انقلابِ روز و شب فهمیدنی است

اے اسیرِ روش و فردا و دنگر
در دلِ خود عالمِ دیگر نگر

در گلِ خود تخمِ ظلمت کاشتی
وقت را مثلِ خطے پنداشتی

باز با پیمانهٔ لیل و نهار
فکرِ تو پیمود طولِ روزگار

ساختی این رشته از نار و دوش
گشته مثلِ تار و ما طلِ فروش

کیمیا بوئی و مشتِ گل شدی
ستّرِ حق زائیدی و باطل شدی

مسلمی؟ آزاد این زنّار باش
شمعِ بزمِ ملّتِ احرار باش

تو کہ از اصلِ زمان آگہ نہ ئ
از حیاتِ جاوداں آگہ نہ ئ

تا کجا در روز و شب باشی اسیر
رمزِ وقت از لی مع اللہ یاد گیر

اصلِ وقت از گردشِ خورشید نیست
وقت جاوید است و خورجا وید نیست

این و آں پیداست از رفتارِ وقت
زندگی تر ہست از اسرارِ وقت

عیش و غم ہا شور و ہم عید است وقت
ستّرِ تابِ ماہ و خورشید است وقت

۱۵ لی مع اللہ وقتٌ حدیث مشہور ۱۲

وقت را مثلِ مکاں گستردۂ
امتیازِ دوش و فردا کردۂ

اے چو بورم کردہ از بستانِ خویش
ساختی از دستِ خود زندانِ خویش

وقتِ ما کو اوّل و آخر ندید
از خیابانِ ضمیرِ ما دمید

زندہ از عرفانِ صیدش زندہ تر
ہستیِ او از سحر تا بندہ تر

زندگی از دیدۂ او زندگی است
لا تسبّوا الدّہر فرمانِ نبی است[۱]

یا دہ یا میکہ سیفِ روزگار
با تو نا دستیِ ما بود یار

[۱] لا تسبّوا الدّہر۔ "زمانے کو برا بھلا مت کہو"۔

تخمِ دیں در کشتِ دلہا کاشتیم
پردہ از رُخسارِ حق برداشتیم

ناخنِ ما عقدۂ دُنیا کُشاد
بختِ این خاک از سجودِ ما کُشاد

از خمِ حق باده گلگون زدیم
بر بُتِ میخانه با شبخون زدیم

اے مئے دیرینه در مینائے تو
شیشه آب از گرمیِ صہبائے تو

از غرور و نخوت و کبر و منی
طعنه بر ناداریِ ما میزنی

جامِ ما هم زیبِ محفل بوده است
سینهٔ ما صاف از دل بوده است

عصر نوازِ جلوه ها آراسته
از غبارِ پائے ما برخاسته

کشتِ حق سیراب از خونِ ما گشت
حق پرستانِ جہاں ممنونِ ما

عالم از ما صاحبِ تکبیر شد
از گلِ ما کعبہ ہا تعمیر شد

حرفِ اقرأ[1] حق بما تعلیم کرد
رزقِ خود را از دستِ ما نقیم کرد

گرچہ فت از دستِ ما ناموسِ دین
ما گدایاں را بچشمِ کم مبیں

در نگاہِ تو زیاں کاریم ما
گہنہ بندیم ما خواریم ما

اعتبار از لا الٰہ داریم ما
ہر دو عالم را نگہ داریم ما

از غمِ امروز و فردا رستہ ایم
با کسے عہدِ محبت بستہ ایم

در دلِ حق تیرِ ما مکنون نیم ما
وارثِ موسیٰ و ہارون نیم ما

[1] اقرأ - تلمیح ہے آیہ شریفہ - اقرأ باسم ربک الذی خلق کیفؔ

مهر و مه در شش زتاب ما هنوز | برقها وارد سحاب ما هنوز

ذاتِ ما آئینهٔ ذاتِ حق است

هستیِ مسلم ز آیاتِ حق است

دُعا

اے چو جاں اندر وجودِ عالمی
جانِ ما باشی و از ما می رمی

نغمہ از فیضِ تو در عودِ حیات
مَوت در راہِ تو مقصودِ حیات

باز تسکینِ دلِ ناشاد شو
باز اندر سینہ ہا آباد شو

باز از ما خواہِ ننگ و نام را
پختہ تر کن عاشقانِ خام را

از مقدر شکوہ ہا داریم ما
نرخِ تو بالا و نا داریم ما

۱؎ عود۔ ایک قسم کا ساز۔ ۱۲

از تہیدستانِ رُخ زیبائے مہوش
عشقِ سلمانؓ و بلالؓ از ما فروش

چشمِ بیخوابِ دلِ بیتابِ ده
بازمارا فطرتِ سیمابِ ده

آیتے بنمازِ آیاتِ مبین [1]
تا شود اعناقِ اعدا خاضعین

کوہِ آتش خیز کُن ایں کاہ را
از آتش ما سوزِ غیر اللہ را

رشتہ وحدت چو قوم از دست داد
صد گرہ بر روئے کارِ ما فتاد

ما پریشاں در جہاں چوں اختریم
ہمدم و بیگانہ از یک دیگریم

باز ایں اوراقِ را شیرازہ کُن
باز آئینِ محبت تازہ کُن

[1] تلمیح ہے آیہ شریفہ (ان نشا ننزل علیہم من السماء آیۃ فظلت اعناقہم لہا خاضعین) کی طرف

بازمارا بر همان خدمت گذار — کارِ خود با عاشقانِ خود سپار

رهروان را منزلِ تسلیم بخش — قوتِ ایمانِ ابراهیم بخش

عشق را از شغلِ لا آگاه کن

آشنائے رمزِ الّا الله کن

منکه بهرِ دیگران سوزم چو شمع — بزمِ خود را گر نیارایم چه شمع

یارب آن اشکے که باشد دلفروز — بیقرار و مضطر و آرام سوز

کارش در باغ و دیدن آتشے — از قبائے لالهٔ شوید آتشے

دل بدل دیده بدیده در فرد استم — در میانِ انجمن تنها نشستم

هر کسے از نخلِ خورشیدِ یمن
از درونِ من نجست اسرارِ من

در جہانِ ما رسمِ نَے نیستاں است
نخلِ سینایم کلیمِ من کجاست

ظالمم بر خود ستم ہا کردہ ام
شعلۂ را در بغل پروردہ ام

شعلۂ غارت گرِ سامانِ ہوش
آتشے افگندہ در دامانِ ہوش

عقل را دیوانگی آموختہ
علم را سامانِ ہستی سوختہ

آفتاب از سوزِ او گردد دوام
بر قہا اندر طوافِ او مدام

ہمچو شبنم دیدۂ گریاں شدم
تا امینِ آتشِ پنہاں شدم

شمع را سوزِ چنیں آموختم
خود نہاں از چشمِ عالم سوختم

شعله‌ها آخر ز هر مویم دمید
از رگِ اندیشه‌ام آتش چکید

عندلیبم از شررها دانه چید
نغمهٔ آتش مزاجی آفرید

سینهٔ عصرِ من از دل خالی است
می‌تپد مجنون که محمل خالی است

شمع را تنها پسین شب نیست
آه یک پروانهٔ من اهل نیست

انتظارِ غمگسارے تا کجا
جستجوئے از دوارے تا کجا

اے ز رویت ماه و انجم مستنیر
آتشِ خود را ز جانم بازگیر

ایں امانت بازگیر از سینه‌ام
خارِ جوہر برکش از آئینه‌ام

یا مرا یک همدمِ دیرینه ده
عشقِ عالم سوز را آئینه ده

موج در بحر است با هم پهلوئے
هست با همدم تپیدن خوئے موج

بر فلک کوکب ندیم کوکب است
ماہِ تابان ہمزبانِ شب است

روز بہ پہلوئے شبِ یار است زند
خویش را امروز بر فردا زند

ہستی جوئے بجوئے گم شود
موجۂ بادے ببوئے گم شود

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص
میکند دیوانہ با دیوانہ رقص

گرچہ تو در ذاتِ خود یکتا ستی
عالمے را از پئے خویش آراستی

من مثالِ لالۂ صحراستم
در میانِ محفلے تنہاستم

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے
از رموزِ فطرتِ من محرمے

همدمِ دیوانهٔ فرزانهٔ

تا بجانانِ دسپارم هوئے خویش

از خیالِ این و آن بیگانهٔ

بار بینم در دلِ او روئے خویش

سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش

هم صنم او را شوم هم آذرش

تمت

اطلاع

بموجب ایکٹ ۱۹۱۴ء کاپی رائٹ مجریہ
فروری ۱۹۱۴ء مثنوی ہذا کے جملہ حقوق
محفوظ ہیں لہٰذا کوئی صاحب قصداً طبع نہ کریں۔

(مصنف)

Muhammad Ghaus
Barrister-at-Law.
Lahore.